غزلیں
فارغ بخاری

غزلیہ

فارغ بخاری

خالد اکیڈمی

۳- بہاولپور روڈ ، لاہور

نئی

نسل

کے نام

غزلیہ

بار اوّل ——— ۱۹۷۹ء

بار دوم ——— ۱۹۸۳ء

ناشر ——— خالد اکیڈمی

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ——— ۲۰ روپے

تعداد ——— ۱۱۰۰

تزئین وکتابت ——— ایم شفیع ظہیر

غزلیہ میری نظر میں

فارغ بخاری کا شعری سفر اپنے پس منظر میں ایک طویل فنی اور تخلیقی ریاضت کی مٹھاس لئے ہوئے ہے جہاں ان کے بہت سے ہم سفر تھک کر بیٹھ رہے ہیں وہ مسلسل آگے ہی آگے رواں ہیں۔ انہوں نے جدید شعری کروٹ سے اجتناب برتنے کی بجائے اپنی عصری صداقتوں کو ایک بڑے شاعر کے تخلیقی جذب کے ساتھ محسوس کیا ہے یوں ان کی شاعری کسی محدود دائرے میں قید ہونے کی بجائے عصر کے پھیلے ہوئے آنگن میں خوشبو بن کر اپنی پہچان کراتی ہے وہ نظریاتی عقیدے کے ساتھ ساتھ فنی تنوع اور تخلیقی رنگا رنگی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ غزلیہ ان کے اس اعتقاد کی تازہ گواہی ہے۔

غزل آج کے دور کے تلخ مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے باوجود ایک مخصوص فنی اور تکنیکی پیراہن سے آزاد نہیں ہو سکی، غزل کے "نیم وحشی صنف سخن" کے اعتراض کا جواب نئے شاعروں نے موضوعات کی ورائٹی، پیکر تراشی اور نئی زبان سے دینے کی کوشش کی، مگر غیر شعوری طور پر نئے تکنیک کے روایتی پیراہن کو نہ صرف قبول کیا بلکہ تسلیم بھی کر لیا۔ نظم میں تکنیک، ہیئت اور اسلوب کے تجربے نثری نظم تک چلے آتے ہیں، مگر اپنے صحن سے نہیں نکلی۔ فارغ بخاری نے نئے نئے ہیئتی اور تکنیکی تجربے کر کے غزل کے مستقبل کے نئے دریچے وا کئے ہیں "غزلیہ" میں یہ تجربے جہاں ان کے مسلسل فنی اور تخلیقی سفر کا اظہار ہیں وہاں انہیں اپنے دور سے بھی کچھ آگے سوچ کا آئینہ دار بناتے ہیں۔

تجربہ برائے تجربہ وقتی طور پر تو چونکا سکتا ہے مگر اپنی روایت نہیں بنا پاتا، محض تجربہ کی حد تک آزاد غزل کے کچھ نمونے ہمارے سامنے آ چکے ہیں مگر انہوں نے سنجیدگی کی بجائے ایک مضحکہ خیز صورت کو جنم دیا ہے، فارغ بخاری کے یہ تجربے محض تجربے نہیں بلکہ ایک بھرپور تخلیقی عمل، مکمل فنی اظہار ہیں اس لئے یہ تجربے تکنیک اور ہیئت کی سطح سے بلند ہو کر تخلیقی رفعتوں کو چھوتے ہیں، متوجہ کرتے ہیں، اور دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

رشید امجد

غزلیہ میں فارغ بخاری جو خود بھی غزل گو شعراء میں مقام رکھتے ہیں لفظوں کی بازی گری کے وسیلے سے غزل پر تسلط نہیں چاہتے بلکہ ایک ٹھوس ہیئتی تجربوں پر اُن کی نظر ہے، غزلیہ میں انہوں نے سب سے پہلے ایک بحر کے دو مصرعوں کی غزلیں شامل کی ہیں، یہاں وہ قافیہ ردیف کی صدیوں پرانی روایت کو تجربوں کی صلیب پر چڑھاتے ہوئے پلاٹوس کی طرح، چلمچی میں ہاتھ دھو کر معصومیت کا اظہار نہیں کرتے، وہ شعوری طور پر لفظ و معنی کے نئے نئے رشتوں کی تلاش میں مہارت اور معرفت کی نئی سطح کی دریافت کے دعوے کے جواز میں کہتے ہیں۔

"غزل کے اشعار میں بھرتی کے مصرعوں کا استعمال اب بھی جاری و ساری ہے کیونکہ غزل کے مروجہ ڈکشن میں شعر دو مصرعوں کے مجموعے کا نام ہے اور ایک مصرعہ مفہوم کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو اسے شعر بنانے کے لئے جا و بے جا دوسرے مصرعے کی گرہ لگانی ہی پڑتی ہے اور ایک اچھے سے اچھا مصرعہ بھی اگر شعر نہ بن سکے تو بے مصرف ہو کر رہ جاتا ہے۔"

فارغ بخاری کے زاویہ نظر میں قافیہ ردیف ایک ایسا قلنچ ہے جس نے فکر کی توانائی تخلیق کو ژولیدگی کے سوا کچھ نہیں دیا چنانچہ نئی معاشی اور سماجی کمٹمنٹ کے تقاضوں کی بازیابی کے لئے فارغ نے غزل کے لغوی معانی و مطالب کے پرانے ڈھانچے توڑ پھوڑ کر ایک سرکش تصور قائم کیا ہے، انہوں نے غزلیہ میں نہ صرف قافیہ ردیف سے آزاد غزلیں کہی ہیں بلکہ بحور و اوزان کا تختہ بھی الٹ دیا۔

اعجاز راہی

○

غزلیہ غزل کی ہیئت میں صرف معمولی رد و بدل کی ایک کوشش نہیں شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے بھی تغزل کے اعلیٰ معیار کی حامل ہے، اس مجموعے کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ یہ سراپا انتخاب ہے، اس لئے مشکل نظر آتا ہے کہ کس شعر کو نظر انداز کیا جائے اور کسے درج کیا جائے، بہرکیف ہیئت کے تجربات کے ضمن میں فارغ صاحب نے مختلف عنوانات کے تحت جو مصرعوں اور مختلف بحور کے اشعار اور چھوٹے بڑے شعروں کی آزاد غزلیں کہی ہیں ان میں ہیئت کی تبدیلی کے باوجود خیال کی رفعت و تازگی، بیان و اسلوب کی تازہ کاری اور جذبہ و فکر کے حسین امتزاج کے ساتھ ساتھ شاعر کی رجائیت اور پر اعتماد لہجہ ایسے اوصاف ہیں جن کی بدولت غزل کا بانکپن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ غزلیہ میں جلوہ فرما دکھائی دیتا ہے۔

مرتضیٰ سید

اعتراضات اور اعترافات

ہمیں چیزوں کو ناموں سے پہچاننے کی کچھ ایسی بُری لت پڑ چکی ہے کہ اب ہم نام کے بغیر کسی چیز کا تصور تک نہیں کر سکتے حالاں کہ جب انسان کے پاس زبان نہ تھی الفاظ نہ تھے اس وقت بھی اشیاء موجود تھیں جو اپنی اچھی بُری قدروں سے پہچانی جاتی تھیں۔

مَیں نے غزل میں کچھ ہیئتی تجربے کرنے کی جسارت کی ہے جو ایک روایت شکن اقدام ہے لیکن اسے میری کمزوری کہہ لیجئے کہ نام رکھنے کی اس فرسودہ روایت سے انحراف نہ کر سکا اور مجھے اس کتاب کا نام "غزلیہ" تجویز کرنا پڑا۔

ادب و فن میں نئے تجربوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ذہن انسانی ہمیشہ تنوع پسند رہا ہے۔ کمرے کے فرنیچر کی ترتیب بھی خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو کچھ عرصہ بعد تغیر پسند طبائع پر گراں گزرتی ہے اور اسے بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ادب فن کو نئے تجربات تازہ خون مہیا کرتے ہیں انہیں نئی زندگی دیتے ہیں نئی فتوحات سے نئی وسعتیں نئے اُفق دریافت ہوتے ہیں۔ اس دنیا کا ہر نیا سفر نئی راہوں نئی منزلوں کا سورج بن کر طلوع ہوتا ہے

اردو نظم میں بیسویں صدی کے ربع اوّل ہی سے نئے تجربات کا باب کھُل گیا تھا اس تحریک کے بانی مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی اور تصدق حسین خالد تھے جب مغربی تعلیم عام ہوئی ہم انگریزی ادب سے روشناس ہوئے تو یہ تحریک اور آگے بڑھی اور انگریزی شاعری کی مجلہ اصناف "سانٹ، ترکِ نظم آزاد و ردیف" وغیرہ اردو میں رواج پانے لگیں آزاد نظم کے بانی مبانی میراجی تھے جنہوں نے اپنے دور کے روشن خیال شعراء کو خاصا متاثر کیا اور جدید آزاد نظم میراجی کے

حوالے سے چل نکلی اس سکول کے ایک ذہین شاعر ن۔ م راشد نے میراجی کے اس تجربے کو نہایت کامیابی سے برتا اور آگے بڑھایا اور اس کے بعد جدید ترین نسل نے ان تجربات کو وسعت دیکر نثری نظم تک پہنچایا۔

برعکس اس کے اردو غزل، نظم سے زیادہ قدیم زیادہ معتبر صنفِ سخن ہونے کے باوجود شروع سے ایک ہی ڈگر پر رواں ہے اس میں شک نہیں کہ غزل میں موضوعی تجربے ہوتے رہتے ہیں اسے گل و بلبل اور زلف و رخ کے دام سے چھڑا کر حقیقت پسندی اور شعوری سوچ سے آشنا کیا گیا، سیاسی سماجی اور اجتماعی انسانی قدروں سے روشناس کرایا گیا داخلیت کے قفس سے رہائی دلا کر خارجی حقائق عصری تقاضوں اور عالمی مسائل کا ترجمان بنایا گیا لیکن ہیئتی تجربات کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہ دی جس سے غزل ایک روایتی صنف بن کر رہ گئی اور اس کی یکسانیت بور کن صورت اختیار کر گئی۔

غزل نے قصیدے کی تشبیب سے جنم لیا فارسی میں شیخ سعدی غزل کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں فارسی کے بعد غزل کی قدامت کے آثار پشتو زبان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ آج سے پانچ سو برس قبل اکبر زمینداروی نے پشتو غزل کی ابتدا کی اس کے بعد مرزا خان انصاری نے اس کی نشوونما میں نمایاں حصہ لیا اور متاخرین پشتون شعراء میں خوشحال خان خٹک اور رحمٰن بابا نے اُسے عروج بخشا۔

اردو شاعری کی ابتدا ہی غزل سے ہوئی دوسری تمام اصناف سخن قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ کی طرح اُردو میں غزل بھی فارسی سے آئی اور اس کی تمام روایات اوزان، بحور، تراکیب اور تلمیحات تک اپنے ساتھ لائی اس لئے اردو غزل کا مزاج ہمیشہ عجمی رہا۔ اور اس سرزمین پر تین سو برس گزارنے کے بعد بھی وہ یہاں کی بو باس کو نہ اپنا سکی یا یوں کہہ لیجئے کہ ہم خود اس کی غیر ملکی روایات کو زندہ رکھنے میں کوشاں رہے اور اسے اپنے ملکی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

غزل کی عمر فارسی کے حوالے سے ایک ہزار برس سے زیادہ ہے جب کہ اردو میں صنف غزل تین سو برس سے مروج ہے فارسی غزل نے اس طویل عرصہ میں سعدی، حافظ، بیدل، نظیری، خسرو، جامی، اقبال اور ایران و برصغیر میں ایسے بے شمار دوسرے عظیم فارسی غزل گو شاعر پیدا کئے جنہوں نے کلاسیکل غزل میں بیش بہا اضافے کئے اور اعلیٰ معیاری غزل کے انبار لگا دیئے۔

اردو غزل نے بھی تین سو سال کے مختصر عرصہ میں میر تقی میرؔ، خواجہ میر درد، سودا، انشا، مصحفی، غالب، مومن، ذوق، داغ، آتش، ناسخ، حالی، فانی، جگر، اقبال، جوش، فراق، مجاز، فیض، احمد ندیم قاسمی اور ایسے لاتعداد بلند پایہ غزل گو شعرا کو جنم دیا جنہوں نے غزل کے مزید امکانات کے ہر گوشے ہر زاویے کو اپنی عقابی نظر اور ہمہ گیر سوچ کی جولانگاہ بنا کر اس میں خیال و فکر کی جدت طرازیاں دکھائیں اور ہزاروں، لاکھوں بے نظیر اشعار سے اردو غزل کو مالا مال کر دیا۔

صدیوں کے اس عمل میں فارسی غزل اور اردو غزل اتنی کثیر تعداد میں کہی گئی ہے کہ اس کے منتخب اور غیر داخلی سرمایہ کا وزن بھی مثنوی ٹنوں کے آخری ہندسوں سے تجاوز کر چکا ہے اور دس صدیوں تک جتنی غزل ہو چکی ہے اگر آئندہ دس صدیوں تک نہ کہی جائے تو کوئی کمی محسوس نہ ہوگی کہ اس کے تمام امکانی مراحل طے ہو چکے ہیں اور سوائے اس کے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ " چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کی جائے لفظوں کی شعبدہ بازی دکھائی جائے اور زبان و محاورے کی بازی گری سے داد و تحسین کے ڈونگرے وصول کئے جائیں یا اسلوب بیچے اور اظہار کے کاریگرانہ پیرایوں سے پٹے ہوئے موضوعات کو دہرا دہرا کر فرضی جدت اور ندرت کے ڈھول بجائے جائیں۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ غزل کے ہیئتی ڈھانچے میں کچھ ایسی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں جو اس کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے احیاء کی ضامن ہوں اور مستقبل میں اس کی نشاۃ الثانیہ کا باعث بن سکیں۔

غزل پر آج تک جتنے اعتراضات ہوئے ہیں ان میں صرف ایک اعتراض نہایت معقول ہے اور وہ یہ کہ غزل میں بھرتی کے اشعار کی بھرمار ہوتی ہے اور شاعری کے آغاز سے متاخرین کے دور تک تو یہ بھرتی اتنی بے انتہا رہی ہے کہ پوری غزل میں دوربین لگا کر ڈھونڈنے سے بھی کام کا ایک آدھ شعر مشکل ہی سے ملتا ہے اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ میر تقی میر جو اردو غزل کے میر کارواں اور غزل کی تاریخ کا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے اس کی پوری کلیات میں اہل نظر صرف "بہتر نشتر" ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئے یہ تو خیر زیادتی ہے ہمارے نزدیک میر کے "بہتر نشتر" کا فقرہ محاورۃً استعمال ہوا ہے تاہم بہتر بھی اس سے دس گنا زیادہ بھی ایسے اشعار جنہیں میر کے نشتر کہا جائے وہ تو زیادہ سے زیادہ اتنے ہی ہوں گے اور میر کے علاوہ دوسرے اساتذہ کے دیوانوں کے لئے تو "کوہ کندن و کاہ برآوردن" والا مقام نظر آئے گا ان کے لئے تو شاید بہتر نشتر والا فقرہ بھی مبالغہ آمیز نظر آئے ہزاروں اشعار کے ان دیوانوں میں قافیہ پیمائی کے شاہکار زیادہ اور "از دل خیزد بر دل ریزد" والے فکر و نظر کے حامل شعر کم بہت ہی کم ملیں گے بلکہ سچ پوچھئے تو ریت کے ان ٹیلوں میں گوہر آبدار کی تلاش سعی لا حاصل معلوم ہوتی ہے کچھ شعراء تو چند غزلوں، چند شعروں کے بل بوتے پر زندہ ہیں اور اکثر و بیشتر ایک شعر یا دو چار مصرعوں کے شہرت یافتہ ہیں۔

ہمارے قدیم غزل گو شعراء میں یہ عیب زیادہ نمایاں ہے وہ دو غزلے سہ غزلے اور ہر غزل میں بیس تیس اشعار سے کم کہنے کو کسر شان سمجھتے تھے کہ پُرگوئی ہی ان کے نزدیک طرۂ امتیاز تھا جس نے انہیں قافیہ پیمائی پر مجبور کر دیا تھا۔

متوسطین میں غالب کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے شاعری کی اس کمزوری کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اردو غزلیات کا نہایت کڑا انتخاب پیش کیا اور اس بدعت کو توڑنے کی یہی کوشش اسے زندہ جاوید بنا گئی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کے معاصرین اور مابعد کے شعراء نے بھی غالب کے اس اجتہاد کو مشعل راہ نہ بنایا اور اسی روایتی ڈگر پر چلتے رہے۔

دورِ جدید میں اس شعور کو عام کرنے کا اعزاز فیض احمد فیض کو حاصل ہے کہ غزل کے لئے زیادہ اشعار کی کوئی قید نہیں دو تین، پانچ اور سات شعروں کی بھی ہو سکتی ہے نئے شعراء نے یہ بات گرہ میں باندھ لی ہے کہ کم شعر اور اچھے شعر کہے جائیں اور اس کے مثبت نتائج سامنے آنے لگے فیض نے یہ نظریہ غالب ہی سے اخذ کیا اور اسے برت کر دکھایا غالب فیض کا محبوب شاعر ہے اس نے غالب سے بہت کچھ سیکھا فیض کا دیدۂ بینا تو فطرت کا عطیہ ہے لیکن قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل دیکھنے میں اس نے غالب ہی سے رہنمائی حاصل کی۔

کم گوئی اور خوب گوئی کا جو نسخہ غالب نے عطا کیا اسے ایک صدی بعد آج کے ہوش مند شعراء نے اپنایا اور زود گوئی و بسیار گوئی کی قبیح روایت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جس سے غزل میں بھرتی کے مواد کا وہ چلن نہ رہا جو قدماء کے ہاں عام تھا لیکن غزل کے اشعار میں بھرتی کے مصرعوں کا استعمال اب بھی اسی طرح جاری و ساری ہے کیوں کہ غزل کی مروجہ ہیئت میں شعر دو مصرعوں کے مجموعہ کا نام ہے اور ایک مصرعہ مفہوم کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو اسے شعر بنانے کے لئے جا و بے جا دوسرے مصرعے کی گرہ لگانا شاعر کی مجبوری ہے کہ اس کے بغیر شعر نہیں ہو سکتا اور ایک اچھے سے اچھا مصرعہ بھی اگر شعر نہ بن سکے تو بے مصرف ہو کر رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بیشتر شعراء کے ایسے کئی مصرعے کچھ اس طرح ضرب المثل بن گئے ہیں کہ ان کے دوسرے مصرعے کسی کو یاد نہیں مثلاً

میر تقی میر ــ کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا
دردِ دل کتنے کئے جمع تو دیوان کیا
میر درد ــ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
مصحفی ــ گل کو شکست رنگ کا پیغام آگیا
کہنے میں میرے اب تو میرا دل نہیں رہا
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
آتش ــ زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
میر انیس ــ ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
مومن ــ کبھی ہم میں تم میں بھی تھی آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

شعلہ سا چمک جائے آواز تو دیکھو!

حالی — ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

غالب ؎ غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

فیض ؎ ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

احمد ندیم قاسمی ؎ میں تیرا حسن تیرے حسنِ بیاں تک دیکھوں

جہاں رُکے تھے سفینے وہیں کنارے تھے

اُسے مٹاؤں گا کیسے جسے بناؤں گا میں

غزل کے شاعر کی دوسری مجبوری قافیہ اور ردیف کی قیود ہیں غزل کا ایک شعر تو بسا اوقات اس کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن جب تک چند شعر اور نہ کہے جائیں غزل نہیں ہوتی اور جب تک غزل نہ ہو اس ایک شعر کا کوئی مصرف نہیں ہوتا اس لئے شاعر کو جبراً قافیہ ردیف کو نبھانے کے لئے ایسے شعر کہنے پڑتے ہیں جو خود اس کے معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔ قافیہ و ردیف کی اس مجبوری نے میر و غالب جیسے جید شعراء سے بھی ایسے شعر کہلوائے۔

میر تقی میر ؎

اسی طرح گر میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی — کہ مقدور بھر تو دوا کر چلے

گل کے دیکھے کا غش گیا ہی نہ میر — منہ پہ چھڑکا میرے گلاب بہت

غالب ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دو

آتشِ دوزخ میں وہ گرمی کہاں — سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

میں ایک عرصہ سے تنگنائے غزل کی اس گھٹن اور بیچارگی و بے بسی کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ یہ تجربے حسبِ ذیل ہیں جو غزل کو وسعت اور تازگی دینے کے امکانات پر محیط ہیں۔

(۱) ایک ہی بحر اور وزن کے مختلف قافیہ ردیف کے مکمل مصرعوں کی غزل۔

(۲) ایک ہی بحر کے مختلف قافیہ ردیف کے مصرعوں کی غزل۔

(۳) ڈیڑھ مصرعے کی آزاد غزل

(۴) مختلف بحور کے مختلف قافیہ ردیف کے اشعار کی غزل

(۵) ایک ہی بحر اور ایک ہی وزن کے مختلف قافیہ اور ردیف کے اشعار کی غزل

ان تجربات کی غرض و غایت غزل گو شعراء کو اظہار کی زیادہ سے زیادہ آزادی دینا اور گہری و دقیق فکری کاوشوں کو غزل کا موضوع بنانے کے مواقع مہیا کرنا ہے اشعار اگر ایک مصرعے ڈیڑھ مصرعے اور بڑے چھوٹے دو مصرعوں میں مکمل اظہار کا ذریعہ بن سکتے ہوں تو انہیں غزل کی ترتیب میں پیش کرنے میں آخر کیا قباحت ہے اور جب قافیہ ردیف کی ناروا پابندی سے نجات پا کر شاعر اپنے جذبات و احساسات کو حرف و صورت کے سانچے میں آسانی کے ساتھ ڈھال سکے تو قافیے ردیف کی جبریت کے لئے دُور کی کوڑی لانے کا عذاب خریدنے سے کیا حاصل ہے کیونکہ شعر کی حقیقی روح تو خیال ہے اس کے لئے فارم تو ضمنی چیز ہے اگر خیال میں ندرت رفعت اور عمق نہ ہو تو قافیے ردیف اور بحر و وزن کی مسیحائی بھی شعر کو لازوال بنانے میں عبث ثابت ہوتی ہے زبان و محاورے کے ماہرانہ کمالات بھی اس ضمن میں جان نہیں ڈال سکتے اور اسلوب کی معجزانہ بیساکھیاں اور فنی مہارت کا اعجاز بھی اُسے بقائے دوام نہیں بخش سکتے "غزلیہ" میں قافیہ ردیف کو مسترد کر کے خیال کو ایک مصرعے، ڈیڑھ مصرعے یا دو مصرعوں میں پیش کر کے شاعر الفاظ کے اسراف کی بدعت سے نجات پا سکتا ہے

حال ہی میں نئی نسل کے نوجوانوں نے نثری نظم کے جو تجربے کئے اس سے ہمارے بڑے بڑے روشن خیال نقاد اور شاعر بھی ایسے الرجک ہوئے کہ اس شعری تحریک کو انہوں نے اپنا ذاتی مسئلہ بنا لیا اور یوں ٹوٹ کر اس کی مخالفت شروع کر دی جیسے ان کی میراث پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہو۔ دیکھا جائے تو ویسے یہ بات کوئی غلط بھی نہیں جب صدیوں کی روایتی اقدار پر چوٹ پڑتی ہے تو ان قدروں کے محافظوں کے لئے موت و حیات کا مسئلہ بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر بدلتے دور میں قدیم و جدید نظریات میں تصادم ہوتا رہا ہے ایک مخصوص فارمولا ذہن کے بزرگوں کے لئے اپنی گھسی پٹی روایات سے دستبردار ہونا اور سرکش ذہنوں کے نظریات کو قبولنا ایک المیہ بن جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ع:

برکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

پی شکست مشکل ہی سے تسلیم کرتے ہیں۔

نظم آزاد کا آغاز کرنے والوں کو بھی پابند نظم کے مدعیوں کے غیظ و غضب کا اسی طرح سامنا کرنا پڑا۔ تجریدی افسانے ڈرامے اور نظم کے خلاف بھی اسی زور و شور سے محاذ آرائی کی گئی لطف یہ ہے کہ ایسے ہر موقع پر معترضین کے اعتراضات کی نوعیت ایک سی رہی ہے جدت پسندوں کو ناری سہل نگار یہ رو اور ان کی تخلیقات کو ناقابل فہم ٹھہرایا جاتا رہا اور عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر دانش وروں نے بعد میں اسی روش کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے اپنانے میں بھی پیش پیش رہے اور یہی ناقابل فہم طرز سخن ان کے لئے قابل فہم بن گئی۔

منٹو اور عصمت چغتائی کے جنسی افسانوں کو فحش اور ننگا ادب کہنے والوں نے آخر جنسی حقیقت کو تسلیم کیا بلکہ اپنے افسانوں میں برتا اس وقت یہی منٹو اور عصمت چغتائی نئی نسل کے باغی نوجوان تھے اب منٹو تو نہیں رہے عصمت آپا پاکستان آئیں تو انہوں نے تجریدی افسانوں سے بیزاری کا اظہار کیا اور انہیں ناقابل فہم ٹھہرایا تو ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی ترقی پسند اور وسیع المشرب خاتون نئے تجربوں سے اس قدر خائف کیوں ہے اور بدلتی قدروں کا اسے احساس کیوں نہیں۔

لیکن سارے بزرگ ایسے نہیں ان میں بھی ایسے روشن خیال حضرات کی کمی نہیں جو عصری صداقتوں کو تسلیم کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے عصمت آپا کے بعد ایک اور بزرگ دانشور ڈاکٹر محمد حسن بھارت سے کراچی وارد ہوئے ان سے بھی تجریدی ادب اور نثری نظم کے متعلق سوالات کئے گئے تو انہوں نے کہا کہ ادب و فن میں ایسے تجربے ہوتے رہتے ہیں یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تشویش کا باعث ہو۔ تجریدی ادب شعراء و داخلیت پسندی کے ضمن میں انہوں نے جواباً بتایا کہ یہ بھی اس دور کے خلفشار کی پیداوار ہے اور نئی اور پرانی اقدار کی آویزش کا لازمی رد عمل ہے۔

دراصل مسئلہ یہ ہے کہ شعراء کی جس کھیپ نے بحر، وزن اور قافیہ، ردیف کے آغوش میں آنکھ کھولی اور ان کی وفاداری میں اپنی عمریں تباہ کر دیں اب ان کی مفارقت انہیں گراں گزرتی ہے کہ یہ ان کی کمزوری بن چکے ہیں اور انہیں ترک کرنا ان کے بس کی بات نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان سے یہ حق چھینا کس نے ہے ادب کی کسی صنف میں نئے ہیتی تجربے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس صنف کے پرانے ڈھانچے کو یکسر منسوخ کیا جا رہا ہے اردو نظم اور غزل کی پرانی دلکشی اسی طرح قائم ہے نئے تجربات ان کو منسوخ کرنے کا کوئی آرڈیننس نہیں ہیں بلکہ ان میں اضافہ کی ایک صورت ہے۔

یہ امر باعث اطمینان ہے کہ ادب و فن نے کبھی ایسا کوئی ضابطہ قبول نہیں کیا جس کی رو سے متعین راستوں کے علاوہ دوسرے نئے یا پرانے راستوں پر سفر کرنا قابل گرفت ہو کیوں کہ یہ زندگی کے ایسے

گرش شعبے ہیں جو کسی جبر کسی پابندی کسی غیر ضروری حساب کو خاطر میں نہیں لاتے اور تاریخ شاہد ہے کہ جہاں کہیں ایسا ہوا سر پھرے دانش وروں نے اس سے انحراف کرنے اور قلم کی آزادی قائم رکھنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ان آمرانہ فیصلوں کی دھجیاں بکھیر دیں ادب و فن کا اپنا ایک نظام ہے اپنی ایک دنیا ہے جہاں فطری آئین چلتا ہے۔

مجھے غزل میں یہ ہیئتی تجربات پیش کرتے ہوئے اس رد عمل کا بخوبی احساس ہے جو غزل کے روائتی فدائین کی طرف سے میری اس جسارت کے خلاف ایک جہاد کی صورت میں رونما ہونا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ان روشن خیال اور وسیع النظر دانش وروں کی تائید و حمایت کا بھی یقین ہے جو ہر جدت اور اختراع کو مستحسن نظر سے دیکھنے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے میں ہمیشہ فراخ دل واقع ہوئے ہیں میں اسے اپنا کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں سمجھتا مجھے یہ دعویٰ بھی نہیں کہ غزلیہ کے یہ تجربے بہت جلد روائتی غزل کو پچھاڑ کر اس کا مقام حاصل کر لیں گے مجھے غزل کی روائتی ہیئت سے کوئی مخاصمت نہیں میں خود اب تک وہ غزل لکھ رہا ہوں اور لکھتا رہوں گا۔ اس غزل کو زندہ رہنا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ہی ان تجربات کو بھی برت کر دیکھنا چاہئے اگر ان میں کوئی خوبی کوئی کشش ہوئی تو رائج ہو جائیں گے ورنہ اپنی موت آپ مر جائیں گے کہ ادب و فن کا بنیادی اصول یہی ہے اس قلمرو میں کوئی کھوٹا سکہ نہیں چل سکتا نہ ہی جبر سے کوئی چیز بات منوائی جا سکتی ہے جہاں تک مخالفت کا تعلق ہے سو یہ کوئی نئی بات نہیں اگر اس چیز سے کام کرنے والے خوف کھاتے تو علم و فن بانجھ ہو کر رہ جاتے اور آج ہم پتھر کے دور میں سانس لے رہے ہوتے۔

اردو زبان و ادب کو تو ابھی ترقی کے کئی مراحل سے گزرنا ہے جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں خصوصاً اردو شاعری کا تو سارا اثاثہ ہی غیر ملکی ہے تین سو برس میں ہماری شاعری عرب کے طلسم سے رہائی حاصل نہیں کر سکی کتنی عجیب بات ہے کہ فارسی عربی الفاظ کی ترکیب تو جائز ہے لیکن فارسی ہندی یا عربی ہندی الفاظ کی ترکیب کو ناجائز سمجھا جاتا ہے اس طرح قافیوں کی خوفناک پابندیوں اور کئی قسم کی دوسری قیود نے شعراء کا ناطقہ بند کر رکھا ہے لکھنے والے کو عہد جہالت کی ایسی بے شمار نا روا اکتی اور روائتی بندشوں سے اپنی ذہانت کا غالب حصہ بڑی بیدردی سے ضائع کرنا پڑتا ہے اصل موضوع اور بنیادی سوچ گھائل ہو کر دم توڑ دیتی ہے اساتذہ کی سند کے بغیر الفاظ کو نئے مفاہیم میں استعمال کرنا جرم سمجھا جاتا ہے اور کسی ذاتی مشاہدے اور تجربے کو اپنے انداز سے بیان کرنا بدعت خیال کیا جاتا ہے۔

ہمیں زبان کو وسعت دینے اور خیال و فکر کو ادبی جمیل طور پر پیش کرنے کے لئے ایسی بیشتر لا یعنی قیود سے گلو خلاصی حاصل کرنا ہوگی تاکہ شاعر اور ادیب کو اپنا ما فی الضمیر صاف، بہتر اور واضح طور پر پیش کرنے میں سہولت ہو وہ اپنی سوچ کی نہ صرف بلندی، بلکہ گہرائی و گیرائی تک بھی قارئین کی رسائی

حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے اس دَور کی برکات کو بھی شعر و ادب کا موضوع بنا کر ان عصری تقاضوں کو پورا کر سکے جس کے بغیر ہمارا ادب ہماری شاعری ہمارا فن اپنے عہد کی بھرپور غمازی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

فارغ بخاری

پشاور ۱۹۷۸ء

گزارشات

(بارِ ثانی)

غزلیہ کی پہلی اشاعت ایسے وقت میں ہوئی جب میں امریکہ اور یورپ کی مسافت کے لئے پابہ رکاب تھا جاتے جاتے خیال آیا کہ تین کتابوں کے مسودے تیار ہیں میری واپسی تک انہیں چھپ جانا چاہیئے۔ روانگی سے ایک ماہ پہلے انہیں ترتیب دے کر ناشروں کی تحویل میں دیدیا۔ چھپنے کو تینوں کتابیں چھپ گئیں اور صرف چھ مہینوں میں ان کے ایڈیشن بھی ختم ہو گئے لیکن مناسب نگہداشت نہ ہونے کے باعث ان میں نہ صرف خاصی غلطیاں رہ گئیں بلکہ البم تعمی خاکوں کے مسودہ سے چار خاکے اور دیباچہ پبلشر سے کھو گیا اور غزلیہ کے پبلشر نے تو پوری پوری کاپیوں اور (?) کا ضائع کر دیا۔ پروف پڑھنے میں یہاں تک بے احتیاطی برتی کہ تین غزلیں دوبارہ چھپ گئیں اور کچھ اشعار جو میں نے قلمزد کئے تھے وہ بھی شامل کر دیئے گئے۔

اس کے باوجود "غزلیہ" کی ملک کے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی اور پشاور، راولپنڈی، لاہور میں اس کی رونمائی کے سلسلے میں بڑی معرکے کی تقریبات ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ کتاب چونکہ اردو غزل میں ہیئتی تجربوں کی پہلی کوشش تھی اس لئے حسبِ توقع ایک عرصہ تک ادیبوں شاعروں اور نقادوں کے لئے موضوع بحث بنی رہی اور مختلف ادبی مجلّوں میں اس پر موافق اور مخالف تبصرے اور مقالات شائع ہوتے رہے۔

میں دونوں قسم کی آراء کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اہلِ قلم حضرات کا شکرگذار ہوں کہ انہوں نے میری ناچیز کوششوں کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات سے ہوئی کہ چند ایک شعراء نے غزلیہ کے تتبع میں خامہ فرسائی بھی کی جن میں میرے عزیز دوست اور اردو کے نامور شاعر قتیل شفائی بھی شامل ہیں جن کی کچھ اسی انداز کی غزلیں مجلّہ "افکار" کراچی اور مجلّہ "ماہِ نو" لاہور میں شائع ہو چکی ہیں۔

دوسرا ایڈیشن کچھ اضافے، ترمیم اور اس توقع کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ

گناہ کردہ ام و چشم آفرین دارم

پشاور۔ ۱۹۸۲ء　　　　فارغ بخاری

غزلیہ

زرد پتوں کو بھی ہے تازہ ہواؤں کی طلب

ہر مسافر اک نئی منزل کا راہی ہے یہاں

جانے کب سے ہوں معلق زندگی کی لفٹ میں

اَب زمین کی بات کرنے سے بھی شرماتے ہیں لوگ

ہم مشینی زندگی کا پُرزہ بن کر رہ گئے

تجربے جو کچھ سکھاتے ہیں کتابوں میں نہیں

چاہتوں سے میرے فن کو تازہ خوں ملتا رہا

کاغذی پھولوں سے اب گلدان بھی سجنے لگے

جس نے بھی پرواز سیکھی پَر لگا کر اُڑ گیا

عکس اپنا بہتے دریاؤں کے آئینے میں دیکھ

ٹوٹتی جاتی ہیں سب زنجیریں گجروں کی طرح

پیڑ سے ہو کر جُدا تلوار بن جاتی ہے شاخ

پھاند کر دیوار اپنے گھر میں اب جاتے ہیں لوگ

فارغ اب ہیں ٹوٹنے کو وقت کے اعصاب سب

غزلیہ

اُڑ رہا ہوں میں نشیلی آندھیوں کے دوش پر

کس کی یاد آئی کہ خوشبو کا خزانہ کھل گیا

نیند سے بوجھل ہیں آنکھیں اور سو سکتا نہیں

سارے رشتوں سے تجھے چاہا ہے ہم نے ٹوٹ کر

ڈھونڈتے ہیں اپنے ہم نقشِ قدم اب چاند پر

فاصلے جتنے بھی سمٹے ہو گئے اتنے طویل

کر دیا کمپیوٹر انساں کو مشینی دور نے

کثرتِ اولاد بھی زحمت ہے انساں کیلئے

اندھی راتوں میں کہاں تک ہم جلائیں گے چراغ

فون پر کرتے ہیں اُلفت ٹی وی پہ ملتے ہیں ہم

میرے اندر بھی بخاری اک جہاں آباد ہے

ہم تو مارے گئے مروت میں

ٹوٹ کر آئینے نہیں جُڑتے

کون آئے گا اس خرابے میں

ہم کو گہرائیوں میں جانے دو

ہر مسافر کی اپنی منزل ہے

ننگے پیڑوں کا موسم آیا ہے

طے کیا ہے بدن بدن ہم نے

بوسہ بر لب اِدھر بھی آؤ کبھی

اتنے مصروف ہیں خدا جیسے

عُمر بھر ہم تو پیڑ گنتے رہے

اک دریدہ دہن پہ مرتے ہیں

غزلیہ

نظر کو رہتی ہے نادیدہ تتلیوں کی تلاش
مسافرو! نئی منزل کی آرزو تو کرو

ہمیں تلاش کرو ٹوٹتے ستاروں میں
سمندروں کی تہوں میں بھی ہیں جہاں آباد

ہر ایک موڑ ہمیں روشنی دکھاتا ہے
ہر ایک لمحے میں اک زندگی گزاری ہے

نشے ملے ہیں ہمیں وہ جو ٹوٹتے ہی نہیں
محبتوں نے نئے حوصلے دیئے ہیں ہمیں

پری وشوں سے بھی ڈرتے ہیں مخبروں کی طرح
بصیرتوں کے سفر نے اجال دیں آنکھیں

ہر ایک لفظ کا اپنا مزاج ہے فارغ

غزلیہ

اِس جسمِ مقدس سے عقیدت نہیں کس کو
دیکھا نہ کسی نے بھی کوئی رنگ ہوا کا

بوسیدہ سی دیواروں کو گھر کون کہے گا
آئینے نے اپنا کبھی چہرہ نہیں دیکھا

مظلوم کا خوں بولے تو پھر چپ نہیں ہوتا
ہر درد کا درماں ہے سحر خیز اُجالا

مقتل کے در و بام پہ اب پھول کھلیں گے
مژدہ ہو کہ ہم آخرِ شب کے ہیں مسافر

غزلیہ

کوئی بھی حالات کو نخچیر کر سکتا نہیں

اپنی ہی تلوار قاتل کے گلے پر ہے رواں

اب صفِ اعداء رجز خوانوں سے خالی ہو گئی

جاگ اُٹھا مجبور انسانوں کا خوابیدہ لہو

مل کی چمنی کا دُھواں کھائے فقط مزدور کیوں

احمقوں کو امن کی ایٹم بموں میں ہے تلاش

وقت کے دھارے کو روکو گے تو خود بہہ جاؤ گے

روشنی محصور ہو سکتی نہیں ظلمات میں

صبح نو کی چاپ گونج اُٹھی ہے فارغ چار سُو

غزلیہ

مرے حساب میں لکھ دو لہو کی تحریریں

اُجالا پھُوٹے گا ہر زخم کے دریچے سے

تم اپنے درد کو اپنا ہی درد مت سمجھو

ہیں کوہسار بہت زندگی کے رستوں میں

اُٹھو اور اُٹھ کے حصارِ ستم مٹا ڈالو

کوئی تو آئے ستاروں کی روشنی لے کر

تجھے ہی دیکھا ہے آنکھوں سے گفتگو کرتے

ہر آشنا نظر آتا ہے اجنبی کی طرح

مرے نصیب میں ہے راکھ مثلِ ایش ٹرے

غزلیہ

آئی بہار زخموں کو پھر روشنی ملی

پتھر جسے سمجھتے ہو وہ آئینہ نہ ہو

اندھی رُتوں نے آنکھوں کی بینائی چھین لی

لفظوں کا کاروبار سراسر زیاں کا تھا

پی اس قدر کہ ہوش و خِرد کا نشہ گیا

قدموں تلے زمیں نہیں پاؤں کیا دھریں

پر کٹ گئے تو کرتوں کے زینے سے کام لے

ہر شب کو ایک اُجلی سحر کا ہے انتظار

سورج تو گویا ایک مسافر ہے شام کا

فارغ نقوشِ پا مرے آٹوگراف ہیں

غزلیہ

زندگی کے سارے دُکھ ہم سمیٹ لائے ہیں

تیری یاد سے کتنی یادیں جاگ اُٹھتی ہیں

کتنی اَن کہی باتیں پلکوں کی زباں پر ہیں

سارے اہلِ فن فارغ اپنے فن میں زندہ ہیں

راس کس کو آئی ہے دوستی سمندر میں

جبر کی عبادت سے اپنی نیند بہتر ہے

ایک ایک لمحے میں زندگی گزاری ہے

غزلیہ

کنواری سانس کا سرگم مرے حواس میں ہے

تری مہک کا رچاؤ ہے انتظار میں بھی

سفر نصیب تو ہم بد نصیب کب سے ہیں

خزاں کی دھوپ گلے سے لگا کے سو جاؤ

نکل کے جائیں کہاں خواب کی فصیلوں سے

کسی نے پیار سے دیکھا تو ہم نہال ہوئے

ہر ایک رہ میں ہے روشن چراغ منزل کا

شگفتہ غنچہ کا ہے سحر تیری آنکھوں میں

وجودِ ذات سے آگے بھی راستے ہیں کئی

خلا میں جا کے گنوا دی ہے ہم نے سنگینی

غزلیہ

سورجوں کی بستی میں اندھے لوگ بستے ہیں

بدلیوں کی صورت ہم بار بار برسے ہیں

ٹوٹتے ستاروں سے روشنی نہیں ملتی

اپنی سوچ کا پتھر راستے کی ٹھوکر ہے

خواہشوں کے محبس میں ہم بسیرا کرتے ہیں

تتلیوں کے مجکو تو سارے رنگ پیارے ہیں

کچھ خیال ایسے ہیں نقطہ بن نہیں سکتے

کوئی بھی محبت میں پارسا نہیں رہتا

منزلوں سے آگے بھی منزلیں ہی ہوتی ہیں

غزلیہ

دیوار کے سائے کو بھی دیوار ہی سمجھو

جو ڈھول بجا لیتے ہیں کچھ کرتے ہیں وہ بھی

اب روزنِ زنداں ہی سے دیکھیں گے چمن کو

ہم جسم کی بوسیدہ عمارت کے مکیں ہیں

وہ زخم جو اندر ہیں تمہیں کیسے دکھائیں

پتوں کی یہ سازش ہے کوئی پھول نہ دیکھے

آوارہ ہوا کو بھی ترستے ہیں کئی لوگ

ہر پیڑ ثمردار نہیں ہوتا ہے فارغ

غزلیہ

ہمارے ساتھ ہر اک رہگذار چلتی ہے

کھلی ہواؤں میں جا کر بکھر نہ جانا کہیں

بسی ہوئی ہے خیالوں میں آنچلوں کی دھنک

مَیں زخم گنتا رہا اور وہ چلی بھی گئی

ہمیں جنوں ہے نئے راستوں پہ چلنے کا

کچھ اختلاف کا رستہ کھلا بھی رہنے دو

کسی کے پاس نہیں تیشۂ صدا کوئی

ہمارے میکدۂ فکر میں نشے ہیں کئی

کٹی ہے عمر اُڑانوں کی آرزو کرتے

مَیں پور پور کا فارغ عذاب جھیلتا ہوں

غزلیہ

ہر شجر کو نہ سایہ دار سمجھ

گانا سیکھا ہے ہم نے چڑیوں سے

ایک چہرے میں کتنے چہرے ہیں

ساری دنیا کے غم مرے غم میں

مجھ کو پگھلاؤ دھوپ بن کے کبھی

مل کی چمنی میں ہے دھواں میرا

میں نئی منزلوں کا راہی ہوں

روشنی کے سفر پہ نکلا ہوں

تجربے زندگی کا حاصل ہیں

فارغ اپنے وجود میں گم ہوں

غزلیہ

ہر کہانی کا میں کردار نظر آتا ہوں

اب تو کوئی بھی بُری بات بُری بات نہیں

ہے کتابوں سے محبت مجھے بچوں کی طرح

رُوٹھنے کا بھی تو انداز نہ آیا تم کو

تتلیاں دیکھ کے بچپن مرا لوٹ آتا ہے

اب تو اس شہر میں آواز بھی اک معجزہ ہے

ہم نے خود ساختہ زنداں بھی بسا رکھے ہیں

غزلیہ

اِک قیامت ہے یہ قربِ ہمسائیگی

دُور تک گھاس پر ہے بچھی چاندنی

پیاس میری نجانے کہاں کھو گئی

اپنے گھر کی بھی قید اب گوارا نہیں

حرفِ آخر نہیں ہے کوئی بات بھی

زندگی جیسے ہو راکٹوں کا سفر

سنگِ پارس ہے میری یہ دیوانگی

میز کرسی قلم میرے ہمراز ہیں

ہر قلمکار تخلیق میں زندہ ہے

غزلیہ

سب کے دِل میں چور چھپا ہے

دِل دوزخ ہے دِل جنت ہے

کون ہوا کا منہ چومے گا

پلک جھپک میں کیا نہیں ہوتا

دِل بھی اِک راڈار ہے یارو!

لحظہ لحظہ ٹوٹ رہا ہوں

رات دن پاگل ہوائیں ہیں ہماری ہمسفر

مختلف بحور کے بڑے چھوٹے مصرعوں کی غزل

ہر ایک غنچے کو شبنم نے شیش محل دیئے

خوشبوؤں کا ہاتھ ہوا کے ہاتھ میں ہے

کھوٹے سکوں سے تونگر ہو نہیں سکتا کوئی

میرا فن ہے رقیب بیگم کا

کرن کے دوش پہ رنگوں کا کارواں نکلا

دل ٹوٹا تو فارغ ہم بھی ٹوٹ گئے

ہر گریباں چاک دیوانہ نہیں

جھیل سی آنکھوں میں سپنوں کی دھنک تیرتی ہے

موسم بدل گیا تو ہوا بھی بدل گئی

کوئی جہالت میں گم کوئی بصیرت میں گم

جنم لیتی ہے خوشبو جب ہوا پھولوں کو بوسہ دے

حقیقت واسطوں سے ہم نے پنہائی ہے قسطوں میں

تضاد اتنا تھا میں اس کے ساتھ چل نہ سکا

کوئی موسم اجنبی موسم نہیں

راستے ہم سفر نہیں ہوتے

اس کے ادھورے نقش مکمل کرے گا کون

ہیں کتنی خوفناک برہنہ حقیقتیں!

دیکھتے ہی تجکو ٹوٹی ہے ہر اک نغمے کی تان

ترے در پہ جا کے دیکھی ہے بلندیوں کی پستی

جنگل جنگل اپنا چہرہ ڈھونڈ رہا ہوں

بوٹا بوٹا پتہ پتہ گلستاں کا حسن ہے بکھرا ہوا

پتھروں میں ڈھل رہے ہیں آدمی،

روشنی ہر موڑ سے مانوس ہے

موسموں نے توڑ ڈالا پارسائی کا طلسم

حسرتوں سے دیکھ گزرے قافلوں کی راکھ کو

اجنبی ہوتے نہیں، ہیں راستے

ہر سفر منزل نہیں

بانسری کی لے میں سارا شہر ہے ڈوبا ہوا

تتلیوں سے خوبصورت ہیں ترے چہرے کے رنگ

فارغ اب آئینہ خانے میں بسر ہوتی ہے انکی زندگی

غزلیہ

ہواؤں کے لبوں پہ بے ثمر شاخوں کا نوحہ ہے
مَیں تنہائی کا چہرہ ہوں

لہو اترا ہوا ہے جاگتی راتوں کی آنکھوں میں
شکستیں کامرانی کا ہمیں مژدہ سناتی ہیں

کسانوں کا لہو ہے پکی فصلوں میں
مَیں قرنوں کا مسافر ہوں

ہر آئینے کو اک دن ٹوٹ جانا ہے
خدا چھپ چھپ کے کرتا ہے عبادت نوعِ انساں کی

دلیلِ ابلیس کی سنتے صفائی کا اسے موقع دیا ہوتا
مَیں خوشبوؤں کا گھائل ہوں

جلاؤ مجھ کو فارغ روشنی ہو کچھ تو راہوں میں

غزلیہ

زندگی بھر کون رہتا ہے کسی کا ہمسفر
مختلف ہیں رنگ یارو اپنے اپنے کرب کے

کھڑکیوں کی طرح آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے
وہ گرانی ہے کہ اب پاؤں سے بھی ہنگے ہیں بوٹ

اس سے تو اس کا ڈبل بیڈ ہے حسین
خواہشوں کے قتل سے بڑھ کر نہیں کوئی گنہ

چونچ سے لیکر پروں تک کیوں نہیں یکساں ہے طوطوں کا رنگ
تیرا میرا ساتھ پیاری بحر اور ساحل کا ہے

اجنبی راہوں کو اپنانے میں طرفہ کیف ہے
رت جگوں کے سر ہے کتنے ہی حسیں خوابوں کا خوں

غزلیہ

ستارہ کوئی کب سے ہے منتظر میری آوازِ پا کا

مرے دل میں ہے سارے عالم کی وسعت

وہی تند موسم وہی رت جگا ہے

جُدا ہو کے تجھ سے میں نقشِ قدم بن گیا ہوں

خداوند کو عرش پر بیٹھنے کی سزا کس نے دی ہے

جدھر ہم گئے راستے بن گئے ہیں

ہر آواز میں اک نئی روشنی ہے

قبائیں یہ آفاق کی تنگ ہیں میری پرواز کے جسم پر

مرے فن میں فارغ محبت کی مہکار ہے

غزلیہ

دائروں میں گھومنے سے منزلیں ملتی نہیں

چُپ میں سب چہرے چٹانوں کی طرح

جلتی رُت میں بھولی لڑکی کو ہے کس کا انتظار

ٹپ سے دِل میں جھکی آنکھوں کی ساری گفتگو

ضربِ تیشہ نغمۂ کہسار ہے

راستے بھی دوستوں کی طرح رہتے ہیں ہمارے منتظر

پربتوں میں قیمتی پتھر بھی ہیں لاوا بھی ہے

شب کو خوابیدہ دریچے جاگ اٹھتے ہیں گنا ہوں کیلئے

حُسن خوشبو، خوشبوئیں نغمہ ہیں نغمہ روشنی

سایۂ دیوار فارغ نطق ہے دیوار کا

موسموں کا آئینہ ہے ہر شجر

کس قدر ہیں خوبصورت غیر فطری راستے

ہم بچھڑنے کے لئے مِلتے رہے

ہر صدا لوحِ ہَوا پر نقش ہے

اپنا اِک کردار ہے ہر پیڑ کا

ہم دھواں بن کر بھی بادل ہی رہے

گرمجوشی سے گلے ملتی ہے ہر اچھی کتاب

گو برے ہوں مر کے اچھی کھاد بن جاتے ہیں ہم

اجنبیت کا اک اپنا ذائقہ ہے رنگ ہے

سردیوں میں برف کا ملبوس بھی پشمینہ ہے

جانے کب سے ہوں میں آوازوں کے جنگل میں اسیر

رشتہ مرا باغ سے ہے دوستی پیڑوں سے ہے

ظلم کی دیوار کا سایہ بھی زہری ناگ ہے

عرش اب گرنے کو ہے بوڑھے خدا کے بوجھ سے

آندھیوں میں بال و پر کس کے سلامت رہ گئے

شاخیں بچوں کی طرح ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے

ہر نئی آواز فارغؔ آفتابِ تازہ ہے

غزلیہ

کوئی سیدھا راستہ منزل پہ پہنچاتا نہیں
زندگانی کی نمو تو خشک ٹیلوں میں بھی ہے

جو زمیں کا بوجھ تھے اب آسماں کا بوجھ ہیں
ہر نئے چہرے سے ڈرتا ہے پرانا آئینہ

ہے ستاروں کو ہماری روشنی کا انتظار
بحر کی پہنائیاں کتنی خیال انگیز ہیں

ہے قفس سے گلستاں تک دو قدم کا راستہ
کس نے دیکھا ہے کبھی شبیر اپنی آنکھ کا

ہر قدم فارغ مرا پرچم نئی منزل کا ہے

غزلیہ

عبادت دنیا والوں نے سمجھ رکھا ہے جھکنے کو
پرستش کفر ہے چاہے کسی کی ہو

فصیلِ شہر زنجیروں میں جکڑی ہے
مرے نزدیک انساں کے سوا خالق نہیں کوئی

شبِ بے خواب ہی میرا مقدر ہے
مکینوں کیلئے گھر بھی فصیلِ شہر بھی زنداں

تجھے دیکھوں تو ہونٹوں پر سے بوسے تڑپتے ہیں
کوئی در کھولدو کوئی دریچہ وا کرو تازہ ہوا آئے

مَیں کس منزل کا راہی ہوں ؟

مشینوں کی فراوانی سے بے مصرف ہوئے انساں
نشے فارغ ہزاروں ہیں شرابوں سے زیادہ بھی

ہر لہجے میں آواز بھی ہے رنگ بھی اپنا

تخلیق ہے شغل

ہر پھول نمائندہ ہے گلشن کی مہک کا

کس درجہ پُراسرار ہے لفظوں کی کہانی

میں جسم کا قیدی ہوں مرا سایہ ہے آزاد

پیڑوں کے بھی شاخوں کے بھی آپس میں ہیں رشتے

اِس جسم کے رازوں کی امیں ہے وہ مسہری

خوشبو ہے گلستاں میں محبت کی علامت

سچائی سے بڑھ کر کوئی جادو نہیں دیکھا

فارغ میں کسی ڈال کا گرتا ہوا پھل ہوں

آہٹوں میں ڈھل گئی ہے زندگی

کتنے پیڑوں پر ہمارے نام ہیں لکھے ہوئے

جادۂ حیرت پہ ہیں ہم گامزن

رات دن پاگل ہوائیں ہیں ہماری ہمسفر

توڑ کر ٹانکے لبِ اظہار بن جاتے ہیں زخم

گھر کی دیواریں برہنہ جسم کا ملبوس بن سکتی نہیں

جانتا ہے کون جسموں کی زباں

قربتوں سے کم نہیں ہوتے دلوں کے فاصلے

فارغ اپنے عہد کی آواز ہے میری غزل

غزلیہ

کتنی حقیقتوں کو ہم نے جنم دیا ہے

یوں لگتا ہے جیسے کچھ کچھ انگ ہمارے ملتے ہیں

سب کے پاؤں میں ہیں وہی مجبوری کی زنجیریں

حال بھی ہیں ماضی بھی ہیں مستقبل بھی ہیں

اتنی دعائیں مانگیں کہ ناکام ہو گئے!

اندھیرا کتنے برہنہ جسموں کو ڈھانپتا ہے

تھکا تھکا سا ہوا کا لہجہ ہے مہرباں سایۂ شجر ہے

میں لمحات کے ٹوٹنے کی صدا سن رہا ہوں

حرفِ آخر نہیں ہے کوئی بات

غزلیہ

کسی کے البم میں اپنی تصویر ڈھونڈتا ہوں

کس کس کو اب اس کی ہم پہچان کرائیں

اب آگہی کے بھنور میں مرا سفینہ ہے

کس نے ہوا کے ہاتھ میں خوشبو کا ہاتھ دیدیا

ہر آئینہ چہروں کا گدا گر ہے ازل سے

ہوا میں تحلیل ہو کے نکلیں گے منزلوں سے

چراغ جلتے رہیں تیرگی کے بجھنے تک

ہوا خوشبو سے بوجھل ہو کے اُڑنا بھول جاتی ہے

ایک ہی رنگ میں رنگ دوں سب کو

غزلیہ

تیری یادوں سے پھر رتجگوں کی ہواؤں کے در کھُل گئے

قربتوں سے الرجک ہے کیوں فاصلوں کا خُدا

زندگی کو ہر اک رُخ سے دیکھا کرو

ڈھونڈ نگر بھی اپنے ٹھکانوں سے ہیں آشنا

اِتنی دنیاؤں میں یہ بتاؤ تمہارا بسیرا کہاں ہے

تنگ پگڈنڈیوں کے سفر کا مزہ اور ہے

رنگ و بُو ہی نہ ہو جس میں وہ پھول کیا

منزلوں پر پہنچ کر نئی منزلوں کی تمنّا ہوئی

قربتیں فاصلوں کا مداوا نہیں

اگلے برسوں میں انساں کے اُڑنے کا امکان ہے

غزلیہ

روپ ندی پر کب سے کھڑی ہے، کوئی تو لوٹ کے آئے

کیا آگ ہے کہ جسمیں تحلیل ہو رہا ہوں

شعر لکھنا لوں ہے، جیسے حسن کے جادو پہ شاعر کی گرفت

چاند سے وابستہ ہے اب بھی مری دیوانگی

پھول مری کمزوری ہیں

تنہائی میں خوب اڑانیں بھرتا ہوں

تازہ ہواؤں روشنیوں کے سنگ رہا ہوں

سارے جہاں کے انگ ہمارے اندر ہیں

چہرے سچ بولتے ہیں

میری تنہائی کا نوحہ بن گیا چڑیا کا گیت

نیند کے موسم میں بھی ہم رتجگے لے کر چلے

اب بھی ان کی یاد آتے ہی مچل جاتا ہے دل

وہ زرد رُت ہے کوئی چہرہ لالہ گوں ہی نہیں

کوئی آمر آدمی کے رُوپ میں آتا نہیں

دجلہ دجلہ خوں رو دیا ہوں صحرا صحرا بھٹکا ہوں

ہر ایک بازی محبت میں ہار آئے ہیں

دل مصلحت آمیز کوئی بات نہ جانے

اِتنا اُونچا اُڑنے والو نیچے بھی دُنیا میں ہیں

اپنی زباں میں کچھ کہتی ہیں ہم سے کمرے کی دیواریں

ہوا کی انگلیوں نے بے سروسامانی لکھ دی میرے چہرے پہ

ایک موسم سے نہیں رہتی بدن کی دوستی

جنوں نے کام کیا اور خرد کا نام ہُوا

رنگ بھی اب کھو چکے ہیں اپنا رنگ

زمیں سے گزرتے ہیں سب راستے زندگی کے

ناگوں سے ڈنک مانگ لیے انسانوں نے

مقتل مقتل پھول کھلیں گے

کرن کے دوش پہ رنگوں کا کارواں نکلا

غزلیہ

میری تنہائی کا نوحہ بن گیا چڑیا کا گیت

نیند کے موسم میں بھی ہم رتجگے لے کر چلے

اب بھی ان کی یاد آتے ہی مچل جاتا ہے دل

وہ زرد رُت ہے کوئی چہرہ لالہ گوں ہی نہیں

کوئی آمر آدمی کے رُوپ میں آتا نہیں

دجلہ دجلہ خوں رو دیا ہوں صحرا صحرا بھٹکا ہوں

ہر ایک بازی محبت میں ہار آئے ہیں

دِل مصلحت آمیز کوئی بات نہ جانے

غزلیہ

اِتنا اُونچا اُڑنے والو نیچے بھی دُنیا میں ہیں

اپنی زباں میں کچھ کہتی ہیں ہم سے کمرے کی دیواریں

ہوا کی انگلیوں نے بے سروسامانی لکھ دی میرے چہرے پہ

ایک موسم سے نہیں رہتی بدن کی دوستی

جنوں نے کام کیا اور خرد کا نام ہُوا

رنگ بھی اب کھو چکے ہیں اپنا رنگ

زمیں سے گزرتے ہیں سب راستے زندگی کے

ناگوں سے ڈنک مانگ لیئے انسانوں نے

مقتل مقتل پھُول کھلیں گے

کرن کے دوش پہ رنگوں کا کارواں نکلا

غزلیہ

میری تنہائی کا نوحہ بن گیا چڑیا کا گیت

نیند کے موسم میں بھی ہم رتجگے لے کر چلے

اب بھی ان کی یاد آتے ہی مچل جاتا ہے دل

وہ زرد رُت ہے کوئی چہرہ لالہ گوں ہی نہیں

کوئی آمر آدمی کے رُوپ میں آتا نہیں

دجلہ دجلہ خوں رویا ہوں صحرا صحرا بھٹکا ہوں

ہر ایک بازی محبت میں ہار آئے ہیں

دل مصلحت آمیز کوئی بات نہ جانے

غزلیہ

اِتنا اُونچا اُڑنے والو نیچے بھی دُنیا میں ہیں

اپنی زباں میں کچھ کہتی ہیں ہم سے کمرے کی دیواریں

ہوا کی انگلیوں نے بے سروسامانی لکھ دی میرے چہرے پہ

ایک موسم سے نہیں رہتی بدن کی دوستی

جنوں نے کام کیا اور خرد کا نام ہُوا

رنگ بھی اب کھو چکے ہیں اپنا رنگ

زمیں سے گزرتے ہیں سب راستے زندگی کے

ناگوں سے ڈنک مانگ لیئے انسانوں نے

مقتل مقتل پھول کھلیں گے

کرن کے دوش پہ رنگوں کا کارواں نکلا

وہ خوشبوئیں جو اُگی ہیں اُداس رُتوں میں
بسا لو دِل میں اُنہیں

ڈیڑھ مصرعوں کی مربوط غزل

لغزشِ پا سے بھی بن جاتے ہیں نقشِ پا کبھی
آدمی قطرہ کبھی دریا کبھی

کیا یہی تعبیر ہے ان خوشنما خوابوں کی جو
ہم نے دیکھے تھے کبھی

کس قدر بے رحم ہے سفّاک موسم کی ہوا
زرد پتّوں کے لیئے

درحقیقت چاندنی اور دھوپ دونوں ایک ہیں
نام ہیں ان کے جدا

گنگناتے ناچتے رنگوں کا دیوانہ ہوں میں
کس قدر پیارے ہیں یہ

روشنی کو ظلمتیں زنجیر کر سکتی نہیں
روشنی ہے روشنی

زخم ہیں ہر فرد کے فارغ جدا
درد لیکن ایک ہے

وقت کی انگلیوں میں سلگتا ہُوا
ایک سگرٹ ہیں ہم
اِک ضرورت ہے اک دوسرے سے یہ وابستگی
نام ہے دوستی
آئنہ بھی تو چہروں کا محتاج ہے
ورنہ پتھر ہے یہ
تلخیوں کی خریداری ہم ترک کردیں اگر
توجنت ہے یہ زندگی
ترا پیار بہتے ہوئے آنسوؤں کے لئے
ایک رُومال ہے
یہ رنج وخوشی محض احساس ہے
اور کچھ بھی نہیں
کئی روگ ایسے ہیں فارغ کہ جو
محض اوہام ہیں۔

اِک عجیب لذّت ہے پڑپڑ جلنے میں
خوشبوئیں چِڑکنے میں
انگ انگ سے اب یوں دھواں سا اُٹھتا ہے
جیسے جل رہے ہوں ہم
طوطے کی طرح جن کو اور کچھ نہیں آتا
اپنا نام جپتے ہیں
مشتری و زہرہ بھی اپنی دسترس میں ہیں
ہم ابھی قفس میں ہیں
آہٹوں کے صحرا میں ہم بھٹکتے رہتے ہیں
زخم سہتے رہتے ہیں
لمس تازہ شاخوں کا آشنا سا لگتا ہے
دِلرُبا سا لگتا ہے
ٹوٹ پھوٹ کے ڈر سے چھپ کے بیٹھے ہیں ایسے
کانچ کے ہوں ہم جیسے

غزلیہ

اب موسموں کے چہرے بھی بے رنگ ہو گئے

دل تنگ ہو گئے

دیواریں کچ ہیں چھت میں ہزاروں شگاف ہیں

تن بے غلاف ہیں

یہ حرفِ بے صدا جو تعاقب میں ہے مرے

کیسے سنوں اسے

محصور ہو گیا ہوں میں لمحے کے درد میں

ماضی کی گرد میں

پھیلی ہے دُور تک مری تنہائیوں کی آگ

گویا ہے دیپ راگ

ہر ایک پیڑ اپنا مجھے ہمنوا لگے!

غم آشنا لگے

غزلیہ

خموشیوں کے لبوں پر بھی کچھ صدائیں ہیں

کوئی سنے تو سہی

وہ خوشبوئیں جو اگی ہیں اداس رستوں میں

بسا لو دل میں انہیں،

نہال دل پہ ہر اک زخم یوں مہکتا ہے۔

کہ جیسے تازہ گلاب

ہوائیں مُردہ دلوں کو پیام دیتی ہیں

کہ صبحِ نو آئی،

کرن کرن کی نگاہوں میں ہے ہمارے لئے

نئی رتوں کا سلام

فضا میں رنگ بھی ہے بوئے خوں بھی ہے فارغ

عجیب عالم ہے

آشنہ دردست رہتے ہیں سدا

اپنی صُورت کے گدا

ہر طرف گہرائیاں ہیں بے شمار

رفعتوں سے ہمکنار

اِن نشیلی انکھڑیوں میں ہیں رَچے

کاک ٹیلوں کے نشے

کِس کی خوشبو نے دلوں کو کر دیا

دیوانگی سے آشنا

اب اندھیرے نئے سورج کی قسم کھاتے ہیں

ٹوٹتے جاتے ہیں

راہزن زرد پہاڑوں میں پنہ گیر ہوئے

وقت کے نخچیر ہوئے

ہر جگہ ظالم و مظلوم کی آویزش ہے

منتظر سب ہیں نئے دَور کے اب

آندھیاں آتی ہیں کُٹیائیں گرانے کے لئے

آنچ آتی نہیں محلوں پہ کبھی

زندگی ایک ڈھرّے پر نہیں رہتی ہے کبھی

دِن بدلتے ہیں رُتوں کی صوُرت

فارؔغ اِس زخم کی گہرائی قیامت کی ہے

چارہ گر پر مجھے رحم آتا ہے

دِل شکن ہی کیوں نہ ہو ہے زندگی پھر زندگی

اِس سے ہے تابندگی

آنکھ کی کھڑکی میں لرزاں رتجگوں کے سائے ہیں

ہم کڑی راتوں کو طے کر آئے ہیں

ہم تھکے ہارے مسافر کون سی منزل کے ہیں

زخم جو کھائے ہیں سارے دِل کے ہیں

سوچتے ہیں آج بھی ننگے مکانوں کے مکیں

یہ کھلے بازار تو ہیں گھر نہیں

قہر ہے فارغ کہ خود ہی بن گیا اپنا عدو

آج انساں کا لہو!

زندگی بھر کون رہتا ہے کسی کا ہمسفر
جب تلک ہوں بال و پَر

ندیاں، دریا، سمندر، سب رواں ہیں دم بدم
ہر قدم اگلا قدم

درحقیقت سُست رو انساں خود اپنے نہیں
بیوفا سپنے نہیں

جن کو آتی ہے دھنک بن کر بکھرنے کی ادا
زندہ رہتے ہیں سدا

عمر بھر جو اجنبی چہروں کا رہتا ہے گدا
سنگ ہے وہ آئینہ

امن کے سورج کی کرتی ہے زمیں اب آرزو
اے خدائے رنگ و بُو

اب تو فارغ گنبدِ افلاک کی ہر رہگذر
ہے ہماری منتظر

بلندیوں میں کشش تو بلا کی ہے لیکن
یہ شرط ہے کہ ہم ان سے کبھی اُتر بھی سکیں

مختلف بحور کے مختلف قافیہ ردیف کے اشعار کی غزل

وہ رہگذر کہ مجھے جس پہ اختیار بھی ہے
مگر میں اس کی اجازت بغیر چل نہ سکوں

بند جب آندھیوں کے ٹوٹ گئے
زندگی بھر کے ساتھ چھوٹ گئے

ڈوبنا ہی مرا مقدر ہے
وہ سمندر ہو یا خلائیں ہوں

کیسی کیسی چہکاریں
اس سناٹے میں دفن ہوئیں

جب بھی سچائی کے پانے کو کوئی نکلا ہے
آخر کار صلیبوں پہ اسے پایا ہے

جس پھول کو خونِ دل سے سینچا
پھوٹا ہے وہ جا کے شاخ زر میں

جانے کیا طوفان اُٹھائیں
دل کی باتیں دل میں رہ کر

مشکل ہی سے لگ سکے کا چوکا
ہر کھیل میں فیلڈنگ کڑی ہے

غزلیہ

جیسے ہم خواب بن کے زندہ تھے — خواب ٹوٹا تو ہم بھی ٹوٹ گئے

کھلی آنکھوں سے دیکھنے والے — عمر بھر کرب سے گزرتے ہیں

ہاتھ اس سے ملا کے دوستوں کو — انگلیاں اپنی گننا پڑتی ہیں

ہیں زخم خوردہ طبیعت مگر رجائی ہے — شکستِ رنگ کی ہر اک صدا غنائی ہے

وہ دورِ ناسپاس آیا — سچائی گناہ بن گئی ہے

ہمارے سامنے وہ بھی ہے اس کی خوشبو بھی — بجھا ہوا ہے مگر انتظار آنکھوں میں

نہ قربتوں کا نشہ اس قدر پلاؤ کہ ہم — کبھی کبھی کے بچھڑنے کو بھی ترس جائیں

بند ہوتی نہیں الہام کی راہیں فارغ
کتنے فرمان ابھی نام بنام آتے ہیں

غزلیہ

ایسی دہشت ہوئی ابنائے وطن پر طاری — بات بھی منہ سے نکلنے لگی سنسر ہو کر

تعبیروں کی سست روی سے منزل منزل ڈھونڈ لائی — خوابوں کی دہلیز پہ کتنے چہروں نے دم توڑ دیا

یوں تو ہر رات کے دامن میں سحر ہے لیکن — آج کی شب تو کہیں صبح کے آثار نہیں

کتنی ہی سچائیاں فارغ گریباں گیر ہیں — صرف پلکوں کے ستارے ہی نہیں درمانِ شب

ہر رگِ گل میں ہے لہو اپنا — اے خدائے بہار ہم کو نہ بھول

جو سچائیوں کا گلوکار ہے وہ کہاں جائیگا — جو کھلے بازوؤں کا پرستار ہے وہ کہاں جائیگا

وصالِ قطرہ و صدف کے قحط میں — کسی گہر کی آرزو، جنوں نہیں؟

کتنی مجبوری ہو فارغ شرم آتی ہے مگر
زرد پتوں کی زمیں کو گلستاں کہتے ہوئے

غزلیہ

ہر پھول کے وجود میں عکسِ بہار ہے
ہر نو شگفتہ غنچے سے خوشبو کو پیار ہے

سمندروں پہ جھکے بادلوں کی سرگوشی
ترے ملن کے نشیلے سمے میں ڈوب گئی

اِک اور سال جسم کو ویران کر گیا
اک اور آندھی آ کے اُڑا لے گئی مجھے

کس جگہ تیز ہوا لے آئی
نہ تھکن اُتری نہ منزل پائی

اپنے ورثے کی یہ بیمار رُتیں
دوسروں کو میں نہیں دے سکتا

ہر ایک چاہتا ہے دوسرے جلیں اُس میں
کوئی بھی آگ بجھانے کو آگے آتا نہیں

اِس سفر پہ نکلے ہیں جس کی منزلیں فارغ
ایسے کاروانوں سے آگے آگے چلتے ہیں

غزلیہ

گئے سمے کو منانے چلے ہیں دیوانے
کرن کٹے وش پہ رنگوں کا کارواں لے کر

تری دستک کا دلآویز نغمہ
مرے کانوں میں ابتک گونجتا ہے

در و دیوار کی نظریں ہیں مجھ پہ
تماشا بن گیا ہوں اس گلی میں

ہر اک صورت اضافی ہے
حقیقت کیا، صداقت کیا

ہزار بار ہوئے محوِ گفتگو مجھ سے
مجھے جو ابھی بطن کو ہسار میں ہیں

ہم سمندر سے دوستی کر کے
ڈوبنے کے عذاب سے چھوٹے

ایک ہی روشنی کا منبع ہے
دھوپ اور چاندنی جُدا تو نہیں

جو تو بضد ہے میرے ہم رکاب چلنے کو
تو اپنے اشکوں کو دل میں نچوڑ کر آنا

غزلیہ

کیا عجب لب بستہ کلیوں کو بھی گویائی ملے
ناتواں جگنو کو سورج کی توانائی ملے

نجانے کس کی تلاش ہم پہن کے بیٹھے ہیں
کہ اپنے آپ سے انجان بن کے بیٹھے ہیں

عنبر میں بو، غنچے میں ہوا، تیرے بدن میں
خوشبو تو بہرحال بکھرنے کے لئے ہے

جل تھل رتوں میں یہ بھی نہ احساس ہو سکا
وہ کس پڑاؤ رہ گئی میں کس سفر میں تھا

کھڑکیاں دروازے وا کرتی ہوائیں آ گئیں
غنچہ و گل کو مہکنے کی ادائیں آ گئیں

کوئی بھی چہرہ نہیں ہے اپنے اصلی روپ میں
سلب ہو کر رہ گئیں ہیں قوتیں پہچان کی

چلی آ یہ زنداں ہے گلستاں تو نہیں پیاری
بڑی چاہت سے یاں دیوانے دیوانوں سے ملتے ہیں

صرف اتنی آس پر آ کر بچھائیں ہم اسے
اپنے بستر ہی کو رہتا ہے ہمارا انتظار

ہم سے پوچھو کس قدر آوارہ و رسوا تھا وہ

کون کہتا ہے کہ فارغ نیک اعمالوں میں تھا

غزلیہ

تو بھی میرے لئے جلتی ہوئی رت تھی پیاری
ملے کیا تجھ کو بھی تپتے ہوئے صحرا کی طرح

غمِ انساں میں غمِ ذات فراموش ہوا
یہ جنوں ہے تو خدا میرا جنوں عام کرے

وہ بھی بیٹھے ہیں سجائے ہوئے مقتل اپنا
جن کو اس دور میں دعویٰ تھا مسیحائی کا

نادم ہیں بہت اپنے عزائم کے بھرم سے
ہر راہگذر حاملہ ہے نقشِ قدم سے

ہر اک نئی تخلیق کا خالق ہے پیمبر
یہ ظرف ہے ان کا کہ جو دعوے نہیں کرتے

کس قدر اپنی جوانی سے ہیں نادم فارغ
ہم سے کچھ اس کی مدارات نہ ہونے پائی

موم کے جسم چھپائے رہو تہہ خانوں میں — اِس کڑی دُھوپ میں نکلے تو پگھل جاؤ گے

کِشتی کی قید کیا ہے جو تقدیر ساتھ دے — دریا میں ڈُوب کر بھی کئی پار اُتر گئے

باطل کے آستاں پہ نہیں ہے جو سجدہ ریز — وہ شخص بھی پیمبرِ دوراں ہے دوستو

کِتنے ہی اور بھی تو ہنر ہیں۔ فقط ! — چاک داماں جنوں کی نشانی نہیں

اُوپر نہ کوئی مَوج، نہ طوفاں، نہ کوئی لہر — نیچے مگر اک بپھرا ہُوا حشر بپا ہے

تمنا کے نغموں سے نیند آتی ہے اب — آنکھ کھُلتی ہے ہاکر کی آواز سے

آخر یہ کس نے مجھ کو اُڑانیں سکھائی ہیں — پرواز بن کے کون مرے بال و پر میں ہے

اسلوب نیا ہو تو مزہ دیتی ہے فاؔرغ
سو بار بھی دہرائی ہوئی بات پرانی

زندگی ایک خستہ سی دیوار ہے — بوجھ لنٹر کی چھت کا اُٹھائے ہوئے

اُنہیں بھی دعوئ ہوش و خرد ہے — ابھی تک جو انگوٹھا چُوستے ہیں

لمحوں کی گرہ جب کھُلتی ہے — ہر خواب سہانا ہوتا ہے

ہم جو تعزیر کے خدشے سے ہیں مہر بلب — کون بدلے گا رہ و رسمِ گلستاں یارو

ایسے بھی کئی لوگ مِلے راہِ وفا میں — گو ساتھ نہیں تھے وہ مگر ساتھ رہے ہیں

تھم گیا ہے وہ آگ کا طوفاں — اب نکل آؤ شامیانے سے

سایا بن جاتے ہیں اوروں کیلئے — کِتنے فیاض ہیں جلنے والے

ہم نے کِتنے صحیفے لوگوں پر
اُفق ذہن سے اُتارے ہیں

رشتوں ناتوں کے حصاروں پہ کھڑا سوچتا ہوں　　اتنی زنجیروں میں مَیں زندہ رہا ہوں کیسے

نصابی وسیلوں سے جو کچھ بھی پہنچا ہے ہم تک　　اسی کو سدا ہم حقیقت سمجھتے رہے ہیں

ہر خطے کی فکری ابھار پر ہے　　خود اس کے معاشی رشتوں کی چھاپ

رتوں کے محتاج اُجڑے کھیتوں کو　　کس ترائی میں لے کے جائیں

ہاتھوں پہ کھچی ہیں ٹیڑھی میڑھی　　تقدیر کے جبر کی لکیریں

ہمیشہ اپنے کناروں ہی میں نہیں بہتے　　کبھی کبھی تو یہ دریا بھی رُخ بدلتے ہیں

زندگی کی کوئی قدر ابدی نہیں　　کل کی سچائیاں آج کا جھوٹ ہیں

کون جانے ابھی اب تک گرد بھی پائی نہ ہو　　ہم جسے سچائی سمجھے ہیں وہ سچائی نہ ہو

آخر ایسی برق رفتاری بھی کیا　　آدمی بن جائے کمپیوٹر نہ بن

بھانپ لیتا ہے عزائم تک ترے　　دل ہے میرا یا کوئی راڈار ہے

زینہ تو دونوں کام آتا ہے　　چڑھ نہیں سکتے، گر تو سکتے ہیں

وقت کی عیاشی ہو سکتی نہیں　　زندگانی کا بجٹ محدود ہے

کتنی حسرت ہے کہ بچوں کی طرح ہم فارغ　　کسی تتلی کے تعاقب میں کبھی کھو جاتے

اب نہ ہم ظلمت میں پالے جائیں گے　　جھونپڑوں تک یہ اُجالے جائیں گے

آبلہ پا ہیں ہمسفر فارغ

کب تلک کوئی انتظار کرے

رشتوں ناتوں کے حصاروں پہ کھڑا سوچتا ہوں — اتنی زنجیروں میں میں زندہ رہا ہوں کیسے

نصابی وسیلوں سے جو کچھ بھی پہنچا ہے ہم تک — اسی کو سدا ہم حقیقت سمجھتے رہے ہیں

ہر خطے کی فکری لہر پر ہے — خود اس کے معاشی رشتوں کی چھاپ

رتوں کے محتاج اجڑے کھیتوں کو — کس ترائی میں لے کے جائیں

ہاتھوں پہ کھچی ہیں ٹیڑھی میڑھی — تقدیر کے جبر کی لکیریں

ہمیشہ اپنے کناروں ہی میں نہیں بہتے — کبھی کبھی تو یہ دریا بھی رُخ بدلتے ہیں

زندگی کی کوئی قدر ابدی نہیں — کل کی سچائیاں آج کا جھوٹ ہیں

کون جانے اسکی ابتک گرد بھی پائی نہ ہو — ہم جسے سچائی سمجھے ہیں وہ سچائی نہ ہو

آخر ایسی برق رفتاری بھی کیا — آدمی بن پائے کمپیوٹر نہ بن

بھانپ لیتا ہے عزائم تک ترے — دل ہے میرا یا کوئی راڈار ہے

زینہ تو دونوں کام آتا ہے — چڑھ نہیں سکتے، گر تو سکتے ہیں

وقت کی عیاشی ہو سکتی نہیں — زندگانی کا بجٹ محدود ہے

کتنی حسرت ہے کہ بچوں کی طرح ہم فارغ — کسی تتلی کے تعاقب میں کبھی کھو جاتے

اب نہ ہم ظلمت میں پالے جائینگے — جھونپڑوں تک یہ اُجالے جائینگے

آبلہ پا ہیں ہمسفر فارغ
کب تلک کوئی انتظار کرے

وقت کا دھارا تو سناٹے میں جم کر رہ گیا
جانے کب شہرِ صدا کا دل پہ دروازہ کھلے

ہم بھی کچھ ایسے باوفا تو نہ تھے
تم سے لیکن شکایتیں ہی رہیں

لب کھلے تو مرمریں ڈھلی وہ دیوی
طوطیٔ ہزار داستاں تھی،

رفتہ رفتہ موسموں کے عارضوں میں گھل گئے
ان گلابی آنچلوں کے رنگ لہراتے ہوئے

کس طرح دل میں بساؤں اس قدر کیفیتیں
زندگی کی ساری جنبوں کا نشہ کیسے کروں

قدرداں ہاتھوں نے وہ سنگ تراشی کی فارغ
کہ ہر اک پیکر پشیماں ہے ثمرور ہو کر

مجکو انساں کی محبت سے تو انکار نہیں
یہ جنوں ہے تو خدا میرا جنوں عام کرے

بلندیوں میں کشش تو بلا کی ہے لیکن
یہ شرط ہے کہ ہم ان سے کبھی اتر بھی سکیں

ایسے شیشہ بدن بھی ہیں فارغ
پیار کے بوجھ سے جو ٹوٹ گئے

میچ کر آنکھیں یہ پوچھا کہ بتا کون ہوں میں
پیارے ہاتھوں نے مجھے نام بتانے نہ دیا

چاند کو دیکھ کے اس نے بھی دعا مانگی ہے
کتنے خورشید ابھی جس کے گریباں میں ہیں

کوئی تو آج جہانگیر بنے
سب ہیں زنجیر ہلانے والے

میرے غمناک قہقہوں سے کبھی
خوشیوں کا کوئی سر نہ بھیگ سکا

تیرے وعدے کا وقت آپہنچا
اور رکشا نظر نہیں آتا

اجنبی ہیں برفباری سے ہم اپنے شہر میں — آشنا رستے بھی اب ہم کو نہیں پہچانتے

پرانی رُتیں بھی ہیں آزُردہ مجھ سے — نئے موسموں کو بھی مجھ سے گلہ ہے

آج کی رات فقط تیرا ہوں — کل کہاں جانے بسیرا ہو گا

تیرے گیسوئے برہم میں یکجا ہوئیں — سینکڑوں قافلوں کی پریشانیاں

بعض اوقات تو حماقت بھی — صدق کے بام کو چھو لیتی ہے

وُہ ایسی زود فراموش ہے کہ اب اُسکو — کتابِ عشق کا کوئی بھی باب یاد نہیں

کارواں کے واسطے ہر موڑ سنگِ میل ہے — کوئی سیدھا راستہ منزل پہ پہنچاتا نہیں

موڈ بنتا ہی نہیں ہے فارغ
تازہ اخبار نہ دیکھوں جب تک

ہم کہ بچ آئے تھے فارغ گمرہیِ جہل سے — اپنے اندر کی بصیرت نے ہمیں بھٹکا دیا

مَیں نامعلوم سمتوں کا مسافر — مقدس جانتا ہوں ہر قدم کو

تمہارے منتظر اپنے رہے ہیں اور یہاں — کٹی ہے عمر اُڑانوں کی آرزو کرتے

زمیں میں مجھکو بو رہے ہیں — کہ میں کسی روز پھر اُگوں گا

خود کتنی سُندر ہے تتلی — لیکن پھول پہ جاں دیتی ہے

ہر عہد میں زمانہ گزرتا رہا مگر — تیری گلی کی راہیں پرانی نہ ہو سکیں

کتب خانہ میں جا کر مجھکو یوں محسوس ہوتا ہے — کہ جیسے اہلِ دانش کی سبھا میں آ گیا ہوں میں

جان کے جنبشِ رائیگاں چھُو کے گذر گیا جہاں
ڈوب کے کوئی دیکھتا ہم بھی تھے بحرِ بیکراں

اے مرے شہر مگر اتنا بھی آباد نہ ہو
کہ تجھے دیکھوں تو جنگل نظر آئے مجھ کو

ایک ہی بحر کے مختلف قافیہ ردیف کے اشعار کی غزل

نثری غزل

ہم ہیں ان قافلوں میں شامل جو
منزلیں پا کے لوٹ آئے ہیں

ہے وہ عالم کہ صاف سنتا ہوں
زندہ لمحوں کے ٹوٹنے کی صدا

پوچھ ان منزلوں کے راہی سے
ہیں کتابوں میں کتنے شہر آباد

گھر سے نکلے تھے تیری یاد کے ساتھ
راستے میں بچھڑ گئے خود سے

سارے منظر بدلتے رہتے ہیں
کوئی بھی نقش پائیدار نہیں

کتنے نالاں تھے رت جگوں سے تم
جاؤ اب گہری نیند سو جاؤ

ماہ و مریخ سر کیئے لیکن
اپنے ہی گھر کا راستہ نہ ملا

سیکھے فارغ کوئی درختوں سے
دشمنوں سے بھی دوستی کرنا

نظر نہ آئی کبھی اپنے گھر کی تاریکی
جلا رہا ہوں میں کب سے چراغ راہوں میں

چمن میں رہتے ہوئے ایسی خو پڑی ہے اب
قفس میں بھی ہمیں رہتی ہے تتلیوں کی تلاش

نظر نظر میں جمالِ بہار کس کا ہے
یہ رت جگوں کو مرے انتظار کس کا ہے

وہ اتنی نازک و نرم و گداز ہے کہ اگر
بریف کیس میں آجائے تو عجب بھی نہیں

کہاں وہ راتیں کہ تنہائیاں قیامت تھیں
اب اپنے سائے کے پہلو میں سو نہیں سکتے

میں دھوپ کی طرح پھیلا ہوں ساری دھرتی پر
مری حرارت و راحت ہے سب جہاں کیلئے

جب کبھی چاہتیں بے رنگ و صدا ہوتی ہیں
کتنی ہی باتیں خموشی میں ادا ہوتی ہیں

اے مرے شہر مگر اتنا ابھی آباد نہ ہو
کہ تجھے دیکھوں تو جنگل نظر آئے مجھ کو

موت انساں کے لئے آخری منزل تو نہیں
ہم کسی رنگ میں اس دھرتی پہ پھر آئیں گے

یوں تو منزل کا تصور ہے بڑا ہوشربا
زہر بن جاتا ہے رفتار کے پیمانے میں

عشق میں جنگ کی قدریں بھی بدل جاتی ہیں
اور پسپا ہوئے ہم لوگ فتوحات کے بعد

شیخ نے کفر کے فتوؤں سے نوازا تھا جنہیں
درِ جنت پہ کھڑے ہیں وہ گنہگار اب کے

ان چراغوں کی جائز ہے عبادت فارغ
آندھیوں سے جو الجھتے ہیں سحر ہونے تک

جو آج نکلے ہیں ہاتھوں میں آئینے لے کر
سدا وہ کرتے رہے ہیں شکار چہروں کا

کبھی تو ذات کے تاریک معبدوں سے نکل
ترے وجود سے آگے بھی راستے ہیں کئی

وہ اپنی تیز خرامی پہ ناز تھا جن کو
ہوا کے ساتھ چلے تھے بھٹک کے لوٹ آئے

دلوں کی بستیاں ویران ہوتی جاتی ہیں
نوا گراں، جنوں، نغمہ، وفا چھیڑو،

میں تیری یاد کو دل سے لگائے پھرتا ہوں
کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہوا ہے مجھے

ہمیں نشے سے تعلق ہے مئے سے کیا مطلب
یہ شکر ہے کہ تصور ترا حرام نہیں

بیانِ میر کے قائل ہیں سب مگر فائغ
وہ آج لیتے ہیں ہم زبانِ میر کی داد

خوشبو کو چومنے کی ہوس عمر بھر رہی
اک اجنبی حسینہ مری ہم سفر رہی

ہر عہد میں زمانہ گزرتا رہا مگر
تیری گلی کی راہیں پرانی نہ ہو سکیں

یکجا بکھر بکھر کے ہوں ہزار بار
میں گلشنِ حیات کا رنگِ پریدہ ہوں

دم توڑتے عقیدوں کا ماتم فضول ہے
زندہ حقیقتوں کو گلے سے لگائیے

کچھ چاہتے ہیں تاج محل بعد مرگ بھی
کچھ جیتے جی بھی دہر میں بے خانماں رہے

اتنے ستم نہ ڈھاؤ کہ یہ بے زبان لوگ
مجبور ہو کے ہاتھ گریباں میں ڈال دیں

اِس عنبریں مہک کو ہوائیں ترس گئیں
وہ خوشبوؤں کو لے گئی جوڑے میں باندھ کر

خوابوں کے جنگلوں میں بھٹکتے ہیں رات دِن
بے نام منزلوں کا ہمیں انتظار ہے

آنکھوں کا نُور پی گئیں زنداں کی ظلمتیں
یہ زندگی کا دور بڑے امتحاں کا ہے

گویا کسی ملامتی فرقے کا فرد ہوں
جو رُت بھی آئی مجھ کو ہی سنگسار کر گئی

وُہ آندھیاں چلیں کہ کئی پیڑ اکھڑ گئے
اِک زرد پتہ شاخ پہ لہرا کے ڈٹ گیا

حیرت سے دیکھتا ہے ہر اک راہرو مجھے
مَیں دشت بے اماں کا وہ تنہا درخت ہوں

فارغ تلاش کرتے ہیں ساحل پہ وہ مجھے
مَیں کیا بتاؤں کون سی گہرائیوں میں ہوں

ہم مثلِ آفتاب جدھر سے گزر گئے
تاریکیوں کی گود اُجالوں سے بھر گئے

بے مایہ کب ہے حاصلِ ذوقِ جنوں مرا
گنجینۂ شکست ہے ہر اشکِ خوں مرا

وُہ سامنے تو بام ہے کیوں بدگمان ہو
زینہ نہیں تو جست لگاؤ جوان ہو

ہوتی ہیں اب خلاؤں میں آوارہ گردیاں
موٹر میں لوگ کرتے ہیں صحرا نوردیاں

اِس خوف سے گھروں سے نکلتے نہیں ہیں لوگ
گردن میں کوئی طوقِ وزارت نہ ڈال دے

اُگتا گیا ہے اِس چمن رنگ و بو سے جو
شاید ہی وہ خلاؤں میں آباد ہو سکے

میری صدا خود اپنی صدا کی ہے بازگشت
میرے جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہیں

اہلِ دول سے اپنا ہے ہر راستہ الگ
ان کا خدا الگ ہے ہمارا خدا الگ

اس قدر کرب تھا فضاؤں میں
مُسکرانے کا حوصلہ نہ ہُوا

میری دھرتی پہ گردشِ دوراں
کس قیامت کی چال چلتی ہے

کیسے اشکوں کو لے کے بیٹھا ہوں
تیرے جلوے نظر کے دامن میں

جراتِ عشق آزماؤ کبھی،
بوسہ بر لب ادھر بھی آؤ کبھی

اِس مقدس بدن کی یاد آئی
کیف کتنا ہے اس عبادت میں

ہم پہاڑوں کو پھاند آئے ہیں
تم فصیلوں کی بات کرتے ہو

کوئی جذبہ اگر نہیں دِل میں
رات کے ڈر سے روشنی نہ کرو

مُلا ناراض ہے کہ کیوں مُرغا
اِس سے پہلے اذان دیتا ہے

ڈوب جانے کا ہے دھڑکا سب کو
کوئی گہرائی میں جاتا ہی نہیں

یوں فروزاں ہے یہ احساس کی لو
اندھی راتوں کا دیا ہو جیسے

جانِ مضمون تھے وہ لوگ کبھی
اب ہیں جو تیرے حوالے کے لئے

وُہ بھی بچھڑے ہیں کٹھن راہوں میں
آج بھی جو میرے ہم راہی ہیں

اتنی نازک ہے کہ جی ڈرتا ہے
کہیں چھونے سے نہ مرجھا جائے

خون بہتا ہے تو بہہ جانے دو
اندھی راتوں میں اجالے کے لئے

فارغ اس دکھ کا مداوا کیا ہو
اب تو ہر سانس میں فریاد سی ہے

تری تلاش میں برگِ خزاں کے رُوپ میں ہم
تمام عمر نسیمِ سحر کے ساتھ چلے،

میں گونجتا ہی رہا طرفہ ماجرا ہو کر
گرفت میں نہ کبھی آسکا صدا ہو کر

نہ کوئی خواب نہ آہٹ نہ بھیگنے کا سماں
یہ کس نے کھولی ہے آنکھوں میں رتجگوں کی دُکاں

مجھے گماں کہ خجل ہو کے وہ بلائیں گے
انہیں یقیں کہ میں پچھتا کے لوٹ آؤں گا

تو موسموں کے تغیر سے یوں اداس نہ ہو،
ہزار نغمے ابھی بربطِ بہار میں ہیں

تمہاری یاد نے آسان زندگی کر دی
کھٹک رہی تھی گراں بارئ حیات مجھے

تمام عمر وہ فارغ بھٹک نہیں سکتا
جو دُو قدم بھی مرے ہم رکاب چلتا ہے

ہوا کی تلوار چل رہی ہے
نئے شگوفوں کا موسم آیا

بہار انساں کا ہے مقدر
خزاں کا جادو نہ اب چلے گا

ہماری یہ ناتمام دنیا
کسی آدمِ نو کی منتظر ہے

کوئی تو ایسی نگاہ اُٹھے
جو ظلمتوں میں شگاف ڈالے

کوئی تو چھیڑے وہ نغمہ جس سے
سماعتیں تشنگی بجھائیں

کوئی تو زینوں کا سحر توڑے
کوئی تو اُڑنے کی رسم ڈالے

پرانی سب مشعلیں بجھاؤ
کوئی نیا آفتاب لاؤ،

نئی بہاروں کے رنگ بھر کر
گلوں کے سب پیرہن بدل دو

بڑھو کچھ ایسی ادا سے فارغ
ہر ایک نقشِ قدم ہو منزل

غزلیہ

آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر ہم کو اک گرتا شجر یاد آ گیا

زندگی کی شاہراہوں میں سدا ہم بچھڑنے کے لئے ملتے رہے

بارہا ایسا ہوا ہم بے ہُنر تتلیوں کی جستجو میں کھو گئے

دکھ ستم کش ہیں بُری جتنی بھی ہو ہر خبر سُننے کو ہم تیار ہیں

ہم کنواری خواہشوں کے کرب کو چاہتے ہیں سننا حرف و صوت میں

جب تلک تجھ سے شناسائی نہ تھی مَیں کسی رشتے کا قائل ہی نہ تھا

کتنی یلغاریں ہوں ظلمت کی مگر
کوئی سورج کو بجھا سکتا نہیں

غزلیہ

جو کسی زنداں میں رہ سکتے نہیں
ان کو ڈھونڈو اک نئے آفاق میں

تیرے میرے جس قدر بھی رنگ ہیں
سارے درد مشترک سے آئے ہیں

ہم سدا سایہ رہے جس پیڑ کا
اس کی چھاؤں اپنی قسمت میں نہ تھی

غور سے دیکھو تو اے دیدہ ورو!
ہے ہر اک خوشبو کا اک کردار بھی

ایک ہی شمشیر کے گھائل ہیں ہم
زخم اپنے اپنے قاتل ایک ہے

تتلیاں بدلیں گی اپنے بال و پر
اب پرانے پیرہن بے کار ہیں

میری ضو پھیلے گی فارغ چار سو
مَیں غزل کے دورِ نو کی ہوں صدا

غزلیہ

ہم گردشِ زمانہ کے ہاتھوں نڈھال تھے
اک چہرہ آ کے ہم کو توانائی دے گیا

پہنے ہوئے ہیں جسموں پہ ہم خوف کا کفن
لوگوں کا ڈر ہُوا تو کبھی اپنا ڈر ہوا

سب کے لیئے بھی اجنبی بن جائینگے اگر
ہمکو کتابیں دیکھ کے پہچان جائینگے

یوں بے دھڑک قیام نہ کر ہر دیار میں
موسم بھی دیکھ، شہر کی آب و ہوا بھی دیکھ

برفاب ہو گیا ہے سلگتا ہُوا بدن
اب شعلے پھُوٹتے ہی نہیں انگ انگ سے

نظروں کو ڈس رہی تھی کل انکی برہنگی
پہنے ہوئے ہیں آج جو یہ سبز وردیاں

جب ہاتھ کٹ گئے تو لہو بولنے لگا
جب لب سِلے تو چہرے کو گویائی مِل گئی

فارغ وہ راہزن ہی سہی کیا گِلہ کریں
اسلوب اتنا پیارا جہاں گفتگو کا ہو

غزلیہ

ترے خیال کی رعنائیوں میں ڈھلنے لگیں
رتیں بھی اب تو تری آہٹوں پہ چلنے لگیں

کیا ہے پیدا تو اب مجھ پہ اعتماد بھی کر
خود اپنی راہ پہ چلنے کا اختیار بھی دے

تمہارے قرب کا اپنا نشہ سہی لیکن
غمِ فراق کی کچھ اور ہی حلاوت ہے

جوانیوں کی ہواؤں میں پھول سی لڑکی
دریچہ کھولا تو خوشبو کی طرح تیر گئی

یہ تیرگی تو بہر حال چھٹ ہی جائیگی
نہ راس آئی ہمیں روشنی تو کیا ہوگا

نہ پوچھ طولِ شبِ ہجر، اُلجھن زنداں میں
اسیر ہو کے جدائی کی رات آتی ہے

ہزاروں قافلے سستا کے چل دیئے فارغ
نجانے یہ شجرِ سایہ دار کس کا ہے

غزلیہ

نہ کوئی پھول، نہ غنچہ، نہ شگوفہ، نہ کلی، تتلیاں کیسے اگ آئی ہیں بیابانوں میں

جسم کا کوئی تقاضا نہ سمجھنے پائے کتنے ناداں تھے محبت کو عبادت جانا

سرکشی کم نہیں ہو پائی ہے طوفانوں سے ہم سے کہسار صفت قابلِ تسخیر نہیں

کوئی یہ غالبِ مرحوم سے کہہ دے فارغ میرے گھر آیا ہے سیلابِ بلا تیرے بعد

غمِ دوراں غمِ جاناں سے بڑھا جاتا ہے ورنہ اس کفرِ مقدس سے کسے پیار نہیں

یہ بھی آباد تھے کل شہرِ نگاراں کی طرح دیکھتے کیا ہو حقارت سے بیابانوں کو

میر صاحب کی طرح عشقِ بتاں میں فارغ

ہم بھی ہیں عزتِ سادات لٹانے والے

غزلیہ

وہ اعتماد ہوں میں جس کے سچے پیڑوں کو پیمبروں کی دمکتی جبیں اگاتی ہے

کبھی تو شہرِ طلسمات چھوڑ کر نکلو کبھی تو ہمسفری میں ہو خوابِ دلداری

دل و جگر کے خرابوں سے ہٹ کے ایک طرف ہر ایک سینے میں کوہِ ندا ہی ملتا ہے

نئی بلندی پہ منظر بسائیں اہلِ خرد حدِ شعورِ تخیل تو زیرِ دام ہوا

ہمارے عہد کا ہے معجزہ کہ آج انساں خیال و فکر کی سب رفعتوں کو پھاند گیا

نحیف قطرہ جو بادل کی ظلمتوں میں پلا جو سطحِ آب پہ اترا تو موجِ دریا تھا

تمہاری یاد کا لمحہ کوئی ابھر آئے کہیں سے کوئی کرن دل کے بام پر آئے

زمانے اور مجھے دوریوں کا زہر نہ دے

کہ پہلے ہی میں کڑے فاصلوں سے آیا ہوں

غزلیہ

ہو گئی ہے نقش تنہائی در و دیوار پہ
اوڑھ کر گھر بھی ہمارا جسم عریاں ہی رہا

جذبہ احساسات کی اک ایسی کشش بھی ہے
جس کو مڑ کر اپنے پیچھے دیکھنا آتا نہیں

ڈوبنے ہی کو اترتے ہیں سبھی دریاؤں میں
پار ہونے کی کبھی کوشش کوئی کرتا نہیں

خوش نصیب انسان کو پھینکو اگر دریا میں بھی
وہ کنارے آلگے گا مچھلیاں تھامے ہوئے

میں بصیرت پا کے کھو بیٹھا ہوں اپنے آپ کو
ایک منظر میں کئی منظر نظر آنے لگے

اپنی چوٹوں کو نہ سہلا، اس کے زخموں کو بھی دیکھ
سنگ کو بھی ناتراشیدہ سا اک چہرہ سمجھ

نامۂ اعمال کے ناخواندہ منشی تا بہ کے
رات دن لکھتے رہیں گے میری جعلی ڈائری

مشغلہ سا ہو گیا ہے اب ہمارا ان دنوں
تازہ اخباروں کو پڑھنا باسی خبروں کیلئے

غزلیہ
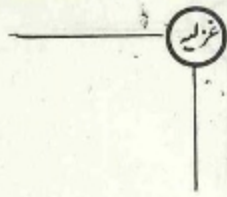
اے شیشہ گرو ایسا بھی آئینہ تراشو
جس میں کہ فقط ایک ہی چہرہ نظر آئے

عورت کا سراپا جو نہ ہوتا تو جہاں میں
انساں کو کبھی رنگوں کی پہچان نہ ہوتی

کس ساعتِ مرہم کیلئے چشم براہ ہو
اب تو وہ روایت ہی نہیں چارہ گری کی

کیا سحر فزا اپنے پشاور کی زمیں ہے
میرے لئے یہ شہر مرا خلدِ بریں ہے

احسانِ طرب درد کے موسم میں ہوا ہے
اس عید کا بھی چاند محرم میں ہوا ہے

کیا کیا نہ ہوئی اپنی وفاؤں سے ندامت
یاد آئے ہیں جب بھی ترے الزام قفس میں

قطرے کی طلب رہتی ہے دریا میں صدف کو
صورت نہیں سیرت ہے بزرگی کی نشانی

روشنی کا ایک رنگ مگر ہر کرن بن گئی ہے قوسِ قزح

ہم انہی پانیوں میں ڈوب گئے جن میں ننھی چکور تیری ہے

ہم طلوع و غروب کے مارے اک مسلسل عذاب سہتے ہیں

بند جب آندھیوں کے ٹوٹ گئے زندگی بھر کے ساتھ چھوٹ گئے

ان میں آواز کون دے گا ہمیں سارے مُردہ ہیں کوئی زندہ نہیں

الجھنوں کو نہ جاں کا روگ بنا راستے راستوں سے نکلے ہیں

کبھی ڈوبے کبھی کنارے لگے

ہم کبھی لوٹ کر نہیں آئے

مَیں اپنے جسم کے سارے نقشے اُسے دیدوں کبھی وُہ پیار سے اگر مطالبہ تو کرے

کہ جس کا پھول بدن کانچ سے بھی نازک ہے وُہ گوری سر پہ گھڑوں کی قطار لے کے چلی

وُہ ایسی چور انگیٹھی ہے جس کے پنڈے سے تپش تو آتی ہے شعلے نظر نہیں آتے

کھُلی ہواؤں سے ہم رشتہ رہ کے زندہ ہوں مَیں خانقاہ کے کسی طاق کا چراغ نہیں

نہ آشیاں نہ فضا میں اماں ہے پنچھی کو یہاں پہ سانپ وہاں پر عقاب کا ڈر ہے

جو سینہ چاک تھے مجرم انہی کو سمجھا گیا نگاہ عدل میں قاتل ہی معتبر ٹھہرا

تری نگاہوں کا جادو وُہ سمجھے گا جس نے کہ چاندنی کو گھنے جنگلوں میں دیکھا ہے

مَیں تیرے قُرب کے لمحوں میں ڈوب جاتا ہوں

فریبِ جلوہ طلوعِ سحر میں آتا ہے

اُداسیوں میں تری یاد جب بھی آئی ہے
نئی بشارتیں چہرے پہ لکھ کے لائی ہے

ازل کے دن سے وہی دل کی خستہ حالی ہے
نجانے کس کے لئے یہ مکان خالی ہے

چمن کی صبحِ طرب کے لئے اسیر ترے
قفس کی تیرہ شبی کا گلہ نہیں کرتے

ہجومِ ماہ وشاں میں یہ میرا عالم ہے
کہ جیسے میلے میں معصوم بچہ کھو جائے

محبتوں کی روایات کو بدلنا ہے
رہِ وفا میں ہمیں سر اُٹھائے چلنا ہے

جو بارشوں کی رُتوں میں نہ بھیگنے پائے
سمندروں میں انہیں کون جا کے نہلائے

نہ مجھ سے چیں بہ جبیں ہو کے بات کر جاناں
مری نگاہ میں شکنیں ہیں تیرے بستر کی

وہ ایک نظم مرصع سہی مگر فارغ
بشت تن میں کچھ اوصاف ہیں غزل کے بھی

تتلیاں دیکھ کر یقیں آیا
میرے بچپن کے خواب زندہ ہیں

مجھ میں سارے موسموں کے رنگ ہیں
کیوں زمانے نے مجھے سوچا نہیں

یہ بد دعا ہے کہ دیوانہ پن ہے کیا کہیے
مدام پگلی ہواؤں کا ہمسفر رہنا

پر ٹوٹ گئے جوہرِ پرواز ہے باقی
الفاظ نہیں ہیں مگر آواز ہے باقی

تمہیں خبر ہے کہ اس پردۂ باغ کے پیچھے
خزاں گزیدہ حسیناؤں کا بسیرا ہے

دیکھ لو ہم کو کوئی دم کے ہیں مہماں یارو
ہم اچانک ہی کبھی اُٹھ کے چلے جائیں گے

کوئی خوشی نہیں اُتری ہمارے آنگن میں
مگر غموں ہی میں ہم قہقہے لگاتے رہے

اب کے شہرِ دل میں ایسی ٹوٹ کر برسی گھٹا
قطرے دریا ہو گئے، دریا سمندر ہو گئے

غزلیہ

جو پُل رشتوں کا ٹوٹا تو یہ دیکھا　　شجر اپنے چمن میں اجنبی تھا

فصیلیں راستہ روکے کھڑی تھیں　　ہمیں ٹوٹے ہوئے پر یاد آئے

مَیں سب سچائیاں دامن میں بھر کر　　یہ کس کی جستجو میں گھر سے نکلا

وُہ ننگے پاؤں بھی آئے تو اس کو　　ہمارے رتجگے پہچان لیں گے

اُڑانوں کا ہُنر جب تک نہ سیکھو　　ہَوا کی چاپ پر کب تک چلو گے

گراں تر ہوں اگرچہ بدمزہ ہوں　　مَیں بے موسم ثمر اس باغ کا ہوں

ہمیں ہے یاد وہ فارغ بخاری

جو مفلس تھا مگر دل کا غنی تھا

غزلیہ

تمام شہر پہ مرگِ سکوت طاری ہے

خزاں رتوں نے ہواؤں میں زہر گھول دیا

ہزار مرحلے آئے ہیں راہ میں لیکن

کسی بھی موڑ پہ طرزِ فغاں نہیں بدلی

مسافتوں ہی سے یہ زندگی عبارت ہے

سفر ہو ختم تو درپیش ہے اک اور سفر

یہ بد دعا ہے کہ دیوانہ پن ہے کیا کہیئے

مدام پگلی ہواؤں کا ہمسفر رہنا

وفا شعار ہیں اپنے فقط در و دیوار

جو رتجگوں میں سدا میرے ساتھ جاگے ہیں

تمام شہر پہ مرگِ سکوت طاری ہے
خزاں رتوں نے ہواؤں میں زہر گھول دیا

ہزار مرحلے آئے ہیں راہ میں لیکن
کسی بھی موڑ پہ طرزِ فغاں نہیں بدلی

مسافتوں ہی سے یہ زندگی عبارت ہے
سفر ہو ختم تو درپیش ہے اک اور سفر

یہ بد دعا ہے کہ دیوانہ پن ہے کیا کہیئے
مدام پگلی ہواؤں کا ہمسفر رہنا

وفا شعار ہیں اپنے فقط در و دیوار
جو رتجگوں میں سدا میرے ساتھ جاگے ہیں